الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

کامیابی کسی آدمی کی اس صلاحیت کا نام ہے کہ
وہ غیر موافق حالات کو موافق حالات میں تبدیل کر سکے

دسمبر ۱۹۸۵
شمارہ ۱۰۹

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۰۹ دسمبر ۱۹۸۵

فہرست

تعصب کی قیمت

اسپین یورپ کے مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ وہ ہزاروں برس سے ایک انتہائی پسماندہ ملک کی حیثیت رکھتا تھا۔ آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں عرب مسلمان اس ملک میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد پہلی بار اسپین کی ترقی شروع ہوئی۔ عربوں کی آٹھ سو سالہ حکومت کے دوران اسپین نے غیر معمولی ترقی کی۔ حتیٰ کہ یورپ کے اسی پسماندہ ملک سے یورپ کی جدید شاندار ترقیوں کا آغاز ہوا۔

مگر تعصب اندھا ہوتا ہے۔ عیسائیوں نے اپنی متعصبانہ ذہنیت کی بنا پر مسلمانوں کے کارناموں کا اعتراف نہیں کیا۔ انھوں نے اسپین کی مسلم سلطنت کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ مسلمانوں کے باہمی اختلافات نے انھیں موقع دیا۔ یہاں تک کہ پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں اسپین سے مسلم سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ تین ملین مسلمان یا تو ملک سے نکال دیے گئے یا بے رحمی کے ساتھ مار ڈالے گئے (ہسٹری آف دی عربس، صفحہ ۵۵۶)

مگر اسپین کے عیسائیوں کا یہ عمل ان کے لیے الٹا پڑا۔ اس سے انھیں اپنے متعصبانہ ذہن کی تسکین کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوا۔ مسلمانوں کے نکلنے کے بعد اسپین کبھی دوبارہ ترقی نہ کر سکا۔ مشہور مورخ لین پول نے اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

> The Moors were banished; for a while Christian Spain shone, like the moon, with a borrowed light; then came the eclipse, and in that darkness Spain has grovelled ever since.
>
> Lane-Poole, *Moors in Spain* p. 280

اسپینی مسلمان ملک سے نکال دیے گئے۔ عیسائی اسپین ایک لمحہ کے لیے چاند کی طرح غیر کی روشنی سے چمکا۔ پھر اس پر گرہن آگیا۔ اور اسپین اس وقت سے آج تک اسی تاریکی کی ذلت میں پڑا ہوا ہے۔ ایک وقت تھا کہ مسلمانوں کا کسی ملک میں جانا وہاں ترقی کا جانا تھا اور مسلمانوں کا وہاں سے نکلنا ترقی کا نکل جانا۔ آج معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ دوسری طرف اسپین اور اس کے جیسے دوسرے ممالک کے لیے بھی اس میں سبق ہے۔ وہ یہ کہ تعصب بظاہر دوسرے کے خلاف کیا جاتا ہے۔ مگر اس کی سب سے بڑی قیمت خود اس قوم کو ادا کرنی پڑتی ہے جس نے تعصب کا معاملہ کیا تھا۔

آہ یہ انسان

انسان خدا کو ناراض کرنے والے الفاظ بولتا ہے، وہ بھول جاتا ہے کہ اس کا خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔

انسان جہنمی افعال کرتا ہے، حالانکہ جہنم کی ایک آنچ سہنے کی طاقت بھی اس کے اندر نہیں۔ آہ، کتنا زیادہ کمزور ہے انسان، اس کے باوجود وہ کتنا زیادہ ڈھیٹ بنا ہوا ہے۔

انسان کے سامنے ایک سچائی آتی ہے جس کا وہ انکار نہ کر سکے، اس کے باوجود وہ اس کو حقارت کے ساتھ نظر انداز کر دیتا ہے۔ انسان کی غلطی دن کی روشنی کی طرح اس پر واضح کی جاتی ہے، پھر بھی وہ اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتا۔ انسان کے پاس اپنے ناصح کو رد کرنے کے لیے کوئی دلیل نہیں ہوتی، مگر وہ عیب جوئی اور الزام تراشی کر کے ظاہر کرتا ہے کہ ناصح اس قابل ہی نہیں کہ اس کی بات مانی جائے۔

انسان خود ظالم ہوتا ہے اور وہ دوسرے کے ظلم کا اعلان کرتا ہے۔ انسان اپنے قدموں کے نیچے فساد برپا کیے ہوئے ہوتا ہے اور دوسروں کو مفسد قرار دے کر وہ ان کے خلاف تخریب کاری کی مہم چلاتا ہے۔ انسان اپنے حقوق کی ادائیگی میں آخری حد تک غافل ہوتا ہے اور دوسروں کے حقوق کا جھنڈا اٹھا کر زمین و آسمان ایک کر دینا چاہتا ہے۔

انسان اپنی قیادت کی خاطر جھوٹے نعرے لگاتا ہے، خواہ اس کے نتیجہ میں پوری قوم ہلاکت کا شکار ہو جائے۔ انسان اپنے کو بڑا بنانے کے لیے دوسروں کو چھوٹا کر دینا چاہتا ہے، خواہ دوسرے کو چھوٹا کرنے کی یہ کوشش خدائی حقیقت کو چھوٹا کرنے کے ہم معنی کیوں نہ ہو۔ انسان خوش خیالیوں میں جیتا ہے، حالانکہ اس دنیا میں حقیقت کے سوا کوئی چیز نہیں جہاں آدمی کو زندگی کا سایہ مل جائے۔

انسان کا حال یہ ہے کہ وہ بالکل بے حقیقت ہوتا ہے اور اپنے کو حقیقت کے روپ میں ظاہر کرتا ہے انسان اپنی بڑائی کے گنبد کو باقی رکھنے کے لیے اپنی ساری طاقت لگا دیتا ہے حالاں کہ آخر کار جو واقعہ ہونے والا ہے وہ یہ کہ وہ اور اس کا گنبد دونوں ایک ہی مشترک قبرستان میں ہمیشہ کے لیے دفن ہو جائیں۔

انسان کو خدا نے جنت میں بسنے کے لیے بنایا تھا، مگر انسان کو جہنم کے راستوں میں دوڑنے کے سوا کسی اور چیز سے کوئی دل چسپی نہیں۔

زمانہ کے خلاف

شہر کی پوش کالونی میں ایک آدمی آواز لگا رہا تھا :

برتن قلعی والا ، برتن قلعی والا

وہ آواز لگاتا ہوا تمام سڑکوں پر گھومتا رہا۔ مگر شاندار مکانات میں سے کسی نے بھی اس کی طرف توجہ نہ دی۔ ساری کالونی میں کسی کے یہاں بھی اس کو کام نہ ملا۔

کیا یہ تعصب کا معاملہ تھا۔ کیا ظلم اور گھمنڈ کی وجہ سے لوگوں نے "برتن قلعی والے" کو کام نہیں دیا۔ ہو سکتا ہے کہ "برتن قلعی والا" اسی طرح سوچتا ہو۔ وہ ایک جاہل آدمی تھا۔ اس کے باپ دادا یہی کام کرتے تھے۔ وہ خود چالیس سال سے یہی کام کر رہا ہے۔ اس بنا پر اس کا ذہن "برتن قلعی" میں اتنا گم ہو چکا ہے کہ وہ اس سے باہر نکل کر سوچ نہیں سکتا۔

مگر جو شخص "برتن قلعی" سے باہر کی حقیقتوں کو جانتا ہو، جو وسیع تر دائرہ میں سوچ سکے، وہ بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ برتن قلعی والے کو کالونی میں کام نہ ملنے کی وجہ کیا تھی۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ تھی کہ قلعی کا کام تانبے پیتل کے برتنوں میں ہوتا ہے، جب کہ کالونی کے تمام مکانات میں اسٹین لس اسٹیل کے برتن استعمال ہو رہے تھے۔ پھر یہاں برتن قلعی والے کو کام ملتا تو کس طرح ملتا۔

موجودہ دنیا میں کامیابی کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی وقت کو پہچانے۔ وہ زمانہ کے تقاضوں سے واقف ہو۔ جو شخص وقت اور زمانہ کو نہ جانے اس کا حال وہی ہوگا جو مذکورہ آدمی کا ہوا۔ وہ اسٹین لس اسٹیل استعمال کرنے والوں کے درمیان "برتن قلعی" کی آواز لگاتا رہے گا اور وہاں کوئی بھی شخص نہ ملے گا جو اس کا خریدار بن سکے۔ وہ اپنی خلاف زمانہ دکانداری کی بنا پر ناکام ہوگا اور پھر دوسروں کو الزام دے گا کہ انھوں نے تعصب اور ظلم کی وجہ سے میری دکان چلنے نہ دی۔ لیاقت کے دور میں تحفظ کا مطالبہ، معانی کی دنیا میں الفاظ کا کرتب دکھانا، حقیقت کے بازار میں خوش خیالی کی قیمت پر سودا حاصل کرنے کی کوشش، یہ سب اسی قسم کی خلاف زمانہ حرکت ہے۔ اور ایسی ہر کوشش کا ایک ہی انجام ہے، اور وہ یہ کہ ان کا کوئی انجام نہیں۔

حکمت کی بات

قال ابن عباس : ما انتفعت بشیٔ بعد النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم انتفاعی بکلمات کتبھن الیّ امیر المومنین علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ قال : کتب الیّ : بسم اللہ الرحمٰن الرحیم . امابعد : فان المرء یفرح بادراك مالم یکن لیفوتہ ۔ ویغتم بفوت مالم یکن لیدرکہ ۔ فاذا آتاك اللہ من الدنیا شیئاً فلا تکثرن بہ فرحًا . واذا منعك منھا فلا تکثرن علیہ حزنا . ولیکن ھمك لما بعد الموت . والسلام

حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد جس کلام سے مجھ کو سب سے زیادہ فائدہ حاصل ہوا وہ امیرالمومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا ایک خط تھا۔ انھوں نے مجھے لکھا :
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ آدمی ایک ایسی چیز کو پاکر خوش ہوتا ہے جس کو وہ کھونے والا نہ تھا۔ اور ایک ایسی چیز کو کھوکر غمگین ہوتا ہے جس کو وہ پانے والا نہ تھا۔ پس جب اللہ تم کو دنیا کی چیزوں میں سے کوئی چیز دے تو تم اس کو پاکر بہت زیادہ خوش نہ ہو۔ اور جب اللہ دنیا کی چیزوں میں سے کوئی چیز تم سے روکے تو تم اس پر بہت زیادہ غمگین نہ ہو۔ اور تمہاری فکر اس چیز کے لیے ہونا چاہیے جو موت کے بعد ہے۔ والسلام

کیوں ایسا ہے کہ لوگ کوئی چیز پاتے ہیں تو اس پر ناز کرنے لگتے ہیں اور اگر وہ کوئی چیز کھوتے ہیں تو غم اور مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ پانے کو کامیابی سمجھتے ہیں اور کھونے کو محرومی۔ حالانکہ اس دنیا میں نہ تو پانا کامیابی ہے اور نہ کھونا محرومی۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں پانا اور کھونا دونوں امتحان کے لیے ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ ہر آدمی کو جانچنا چاہتا ہے۔ اسی مصلحت کے تحت وہ کبھی کسی کو ایک چیز دیتا ہے اور کبھی کسی سے کوئی چیز چھین لیتا ہے۔ دونوں ہی کا مقصد آزمائش ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اس کا بندہ پاکر کیسا بنتا ہے اور کھو کر اس کا کیا حال ہوتا ہے۔ آدمی اگر اس حقیقت کو جان لے تو پانے پر فخر وناز کرنا بھی اس کو اتنا ہی بے معنی معلوم ہوگا جتنا کھونے پر آہ وفغاں کرنا۔

بادشاہ بھی

دور اول میں خلافت اسلامی کو غیر معمولی پھیلاؤ ہوا۔ اس کے باوجود بنو امیہ کے عہد تک خلافت کا ایک ہی مرکز (دمشق) تھا۔ عباسی انقلاب کے بعد اندلس میں علاحدہ سلطنت قائم ہوئی۔ اس طرح حکومتِ اسلامی کے دو مرکز ہوگیے۔ جلد ہی بعد مراکش میں تیسرا آزاد سیاسی مرکز قائم ہوا۔ پھر مصر میں خود مختار حکومت قائم ہوگئی۔ اس طرح ایک کے بعد ایک آزاد مسلم سلطنتیں قائم ہوتی چلی گئیں۔ ایک عظیم مسلم سلطنت بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہوگئی۔

انھیں آزاد سلطنتوں میں سے ایک وہ تھی جس کو دولت سامانیہ کہا جاتا ہے۔ سامانی سلطنت ایران میں ابھری اور تقریباً ڈیڑھ سو سال تک قائم رہ کر ختم ہوگئی۔

اسی سامانی سلطنت کا ایک حاکم نصر بن احمد بن سامان (۳۰۱ - ۳۳۱ھ) تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب اس نے نیشاپور کو اپنی سلطنت میں شامل کیا تو نیشاپور میں داخل ہوکر وہاں اس نے ایک دربار کیا۔ جب وہ اپنے مخصوص تخت پر بیٹھا تو اس کی فرمائش کے مطابق تخت نشینی کی افتتاحی رسم قرآن کی تلاوت سے شروع ہوئی۔ مجلس میں ایک عالم اور حافظ موجود تھے۔ انھوں نے قرآن کی تلاوت کی۔ انھوں نے سورہ المومن کا ایک حصہ پڑھا جس میں یہ آیت بھی تھی:

یوم ھم بارزون لایخفی علی اللّٰہ منھم شئ۔ لمن الملک الیوم للّٰہ الواحد القھار (المومن ۱۶)

جس دن کہ وہ ظاہر ہوں گے۔ اللہ سے ان کی کوئی چیز چھپی ہوئی نہ ہوگی۔ آج بادشاہی کس کے لیے ہے۔ اللہ واحد و قہار کے لیے۔

مذکورہ بزرگ جب قرآن پڑھتے ہوئے اس آیت پر پہونچے تو سلطان نصر بن احمد پر لرزہ طاری ہوگیا۔ وہ ہیبت زدہ ہوکر تخت سے اتر پڑا۔ تاج کو اپنے سر سے اتارا اور سجدہ میں گر گیا۔ اس نے کہا: اے میرے رب۔ بلاشبہ بادشاہی تیری ہے نہ کہ میری۔

سلطان کو جس چیز نے تخت سے اترنے پر مجبور کیا وہ اس کی حقیقت پسندی تھی۔ یہ حقیقت پسندی بلاشبہ انسان کی سب سے بڑی صفت ہے۔ حقیقت پسند انسان ہی سچائی کا اعتراف کرتا ہے۔ حقیقت پسند انسان ہی اس دنیا میں اعلیٰ کارنامے انجام دیتا ہے۔

ہار میں جیت

دوسری عالمی جنگ (۴۵-۱۹۳۹) میں ابتداءً امریکہ براہِ راست شامل نہ تھا۔ تاہم ہتھیار اور سامان کے ذریعہ اس کی مدد برطانیہ اور اس کے ساتھیوں کی طاقت کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ چنانچہ جاپان نے امریکہ کے خلاف ایک خفیہ منصوبہ بنایا۔ اس نے ۷ دسمبر ۱۹۴۱ کو اچانک امریکہ کے بحری اڈہ پرل ہاربر (Pearl Harbor) پر شدید حملہ کیا اور اس کو تباہ کر دیا۔ تاہم امریکہ کی ہوائی طاقت بدستور محفوظ رہی۔

یہ وہ وقت تھا جب کہ امریکہ میں ایٹم بم کی پہلی کھیپ زیر تکمیل تھی۔ چنانچہ اس کے مکمل ہوتے ہی امریکہ نے جاپان سے مطالبہ کیا کہ وہ غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دے ورنہ اس کو برباد کر دیا جائے گا۔ جاپان کو امریکہ کی جدید قوت کا اندازہ نہ تھا، اس نے اس کو منظور نہیں کیا۔ چنانچہ ۱۴ اگست ۱۹۴۵ کو امریکہ نے جاپان کے دو صنعتی شہروں، ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے۔ ایک لمحہ میں جاپان کی فوجی طاقت تہس نہس ہو کر رہ گئی۔ جاپان نے مجبور ہو کر ہتھیار ڈالنے کا اعلان کر دیا۔

اس کے فوراً بعد جنرل میکارتھر (Douglas Macarthur) امریکی فوجوں کے ساتھ جاپان میں اُتر گئے۔ جاپان کے اوپر مکمل طور پر امریکہ کا فوجی قبضہ ہو گیا۔

جاپان اگرچہ خالص ہتھیار کے اعتبار سے شکست کھا چکا تھا مگر جاپانیوں کے درمیان جنگی جنون بدستور باقی تھا۔ جاپانیوں کا جنگی جنون اس زمانہ میں اتنا بڑھا ہوا تھا کہ وہ اپنے جسم میں بم باندھ کر جہازوں کی چمنی میں کود جاتے تھے۔ اب جنرل میکارتھر کے سامنے یہ سوال تھا کہ اس جنگی جنون کا خاتمہ کس طرح کیا جائے۔ جنرل میکارتھر نے اس کا حل اس تدبیر میں تلاش کیا کہ جاپانیوں کے جذبہ کو جنگ سے ہٹا کر معاشی سرگرمیوں کی طرف پھیر دیا جائے۔ ایک امریکی مبصر اینتھونی لیویس (Anthony Lewis) نے لکھا ہے:

When Japan surrendered, 40 years ago, Gen. Douglas Macarthur undertook not just to occupy but to remake the country. If he had been asked then what his most extravagant hope was, I think he might have said: to channel the drive of this aggressive people away from militarism and into economic ambition.

جب جاپان نے ۴۰ سال پہلے ہتھیار ڈالے تو جنرل میکارتھر نے نہ صرف جاپان پر فوجی قبضہ کرلیا بلکہ اسی کے ساتھ ان کی مہم یہ تھی کہ وہ ملک کی از سر نو تشکیل کریں۔ اگر اس وقت ان سے پوچھا جاتا کہ ان کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے تو میرا خیال ہے کہ وہ یہ کہتے کہ جاپان کے جارح عوام کے جوش کو جنگ کے بجائے اقتصادی حوصلوں کی طرف موڑ دینا۔ (ٹائمس آف انڈیا ۲۶ اگست ۱۹۸۵)

اب جاپان کے لیے ایک صورت یہ تھی کہ وہ اپنے ذہن کو باقی رکھتا۔ اگر کھلے طور پر میدان جنگ میں لڑنے کے مواقع نہیں تھے تو خفیہ طریقہ پر امریکہ کے خلاف اپنی مقابلہ آرائی کو جاری رکھتا۔ آخری درجہ میں وہ اس کام کو کر سکتا تھا جس کا نمونہ ہندستان کے مسلمانوں میں نظر آرہا ہے۔ یعنی اپنے مفروضہ حریف کے خلاف الفاظ کی بے فائدہ جنگ جاری رکھنا۔

مگر جاپان نے فاتح کی پیش کش کو قبول کرتے ہوئے فوراً اپنے عمل کا رُخ بدل دیا۔ اس نے امریکہ سے براہِ راست ٹکراؤ کو مکمل طور پر ختم کر دیا اور اپنی تمام قوتوں کو سائنسی تعلیم اور ٹکنکل ترقی کے راستہ میں لگادیا۔

اس کا نتیجہ عظیم الشان کامیابی کی شکل میں برآمد ہوا۔ جاپان نے تیزی سے اقتصادی ترقی شروع کی۔ اس نے ۱۹۷۱ میں چھ بلین ڈالر کا تجارتی سامان امریکہ بھیجا تھا، اس کے بعد جاپانی مصنوعات کی مقبولیت امریکہ میں بڑھتی رہی یہاں تک کہ موجودہ اندازہ کے مطابق ۱۹۸۵ میں جاپان کے مقابلہ میں امریکہ کا تجارتی خسارہ (Trade deficit) کی مقدار ۴۵ بلین ڈالر تک پہونچ جائے گا (ٹائمس آف انڈیا ۴ ستمبر ۱۹۸۵)

نیوز ویک (۱۲ اگست ۱۹۸۵) میں ایک رپورٹ بعنوان (*JAPAN: The 40-year Miracle*) چھپی ہے۔ اس میں ۱۹۴۵ میں جاپان کی کامل بربادی کے چالیس سال بعد اس کی غیر معمولی ترقی کی تفصیلات بیش کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ جاپانی قوم افسانوی پرندہ کی طرح خود اپنی راکھ کے اندر سے اٹھ کھڑی ہوئی:

The nation rose like the mythical phoenix from its own ashes.

جاپان کو خود اپنے فاتح کے مقابلے میں یہ کامیابی اس لیے حاصل ہوئی کہ اس نے اپنی ناکامی کا اعتراف کرلیا۔ حقیقت کا اعتراف ہی اس دنیا میں کامیابی کا واحد راز ہے۔ اگرچہ بہت سے نادان لوگ حقیقت کے انکار میں کامیابی کا راز تلاش کرنے لگتے ہیں۔

زمانہ کی قسم

وَالْعَصْرِ۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ قسم ہے زمانہ کی۔ بے شک انسان بڑے خسارہ میں ہے، سوا ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔

عصر کا مطلب ہے گزرا ہوا زمانہ۔ "گزرتے ہوئے" زمانہ میں انسان ایک "ٹھہری ہوئی" مخلوق ہے۔ وہ بقیہ کائنات کے سرگرم قافلہ کے ساتھ لازمی طور پر بندھا ہوا نہیں ہے۔ انسانی زندگی کی یہ آزاد نوعیت بتاتی ہے کہ اس دنیا میں کامیابی کے لیے آدمی کو بالارادہ کوشش کرنا ہے، جب کہ ناکامی اس کی طرف اپنے آپ چلی آرہی ہے۔

ایک بزرگ نے کہا کہ سورۂ عصر کا مطلب میں نے ایک برف بیچنے والے سے سمجھا جو بازار میں آواز لگا رہا تھا کہ لوگو اس شخص پر رحم کرو جس کا اثاثہ گھُل رہا ہے، لوگو اس شخص پر رحم کرو جس کا اثاثہ گھُل رہا ہے۔ اس کی پکار کو سن کر میں نے اپنے دل میں کہا کہ جس طرح برف پگھل کر کم ہوتا رہتا ہے اسی طرح انسان کو ملی ہوئی عمر بھی تیزی سے گزر رہی ہے۔ عمر کا موقع اگر بے عملی یا بُرے کاموں میں کھو دیا جائے تو یہی انسان کا گھاٹا ہے (تفسیر کبیر امام رازی)

انسان اپنی عمر رواں کے ساتھ آخرت کے ابدی انجام کی طرف چلا جا رہا ہے۔ وہ ایسے فیصلہ کن مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے جہاں کامیابی صرف اس شخص کے لیے ہے جس نے اپنے عمل سے اس کا استحقاق پیدا کیا ہو۔ جو شخص عملی استحقاق کے بغیر وہاں پہونچے اس کے لیے آخرت کے دن ابدی بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

موجودہ دنیا ایک انتہائی مکمل دنیا ہے۔ یہاں انتہائی بامعنی قسم کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ اور یہ سب کچھ ایک پابند نظام کے تحت ہو رہا ہے۔ وسیع کائنات اپنے بے شمار اجزاء کے ساتھ ایک زبردست خدائی قانون میں جکڑی ہوئی ہے۔ ہر چیز ٹھیک وہی کرنے پر مجبور ہے جس کے لیے اس کو بنایا گیا ہے۔ مگر انسان کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ انسان، دوسری تمام چیزوں کے برعکس، بالکل آزاد ہے۔ اگرچہ انسان کی فلاح بھی تمام تر اسی میں ہے کہ وہ بقیہ کائنات کا ہم سفر بن جائے۔ تاہم کائناتی طریقہ کو اختیار

کرے یا نہ کرے کا معاملہ تمام تر اس کی اپنی مرضی پر منحصر ہے ۔ وہ چاہے تو اس کو اپنالے اور چاہے تو نہ اپنائے ۔

کائنات کے مقابلہ میں انسان کی مثال ایسی ہے جیسے ٹرین کے مقابلہ میں اسٹیشن پر کھڑے ہوئے مسافر کی ۔ ٹرین اپنے تمام اجزاء سمیت انجن کے ساتھ بھاگی چلی جارہی ہے ۔ ٹرین کا ہر ڈبہ انجن سے بندھا ہوا ریل کی پٹری پر دوڑ رہا ہے ۔ مگر مسافر اور ڈبہ میں یہ فرق ہے کہ ڈبہ تو انجن سے بندھا ہوا اپنے آپ چلا جارہا ہے ۔ مگر انسان اس وقت ٹرین کا مسافر بنتا ہے جب کہ وہ بالقصد اپنے کو اس کے اندر داخل کرکے اس کا شریک سفر بننے پر راضی ہوجائے ۔ گویا ہم کو ٹرین کا ہم سفر بننے کے لیے تو ارادی عمل کی ضرورت ہے مگر ٹرین سے بچھڑنے کے لیے کسی عمل کی ضرورت نہیں ۔ بچھڑنے کا واقعہ اپنے آپ ہورہا ہے ، ٹھیک ویسے ہی جیسے برف پگھل کر ختم ہونے کا واقعہ اپنے آپ ہورہا ہے ۔ مگر اس کو بیچ کر اس سے نفع حاصل کرنے کے لیے بالقصد عمل کی ضرورت ہے ۔ یا جیسے کسی طالب علم کے امتحان میں ناکام ہونے کے لیے تو صرف اتنی بات کافی ہے کہ وہ کچھ نہ کرے ۔ لیکن اگر وہ کامیاب ہونا چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ امتحان کے نظام میں اپنے آپ کو شریک کرے اور ان تقاضوں کو پورا کرے جو تعلیم کے ذمہ داروں نے مقرر کیا ہے ۔

انسان کی زندگی کا زیادہ بڑا حصہ وہ ہے جو موت کے بعد شروع ہونے والا ہے ۔ موت سے پہلے کی زندگی اس کے پورے عرصۂ حیات کا محض ایک ابتدائی وقفہ ہے ۔ یہی مختصر وقت انسان کا اصل سرمایہ ہے کیوں کہ اسی پر اس کی آئندہ آنے والی طویل تر زندگی کا فیصلہ ہونا ہے ۔

اس مختصر وقت کو صحیح طور پر استعمال کرنا انتہائی ضروری ہے ۔ اس میں معمولی غفلت بھی ناقابلِ تلافی نقصان کی صورت میں انسان کو بھگتنی پڑے گی ۔

اس مختصر وقت کو صحیح استعمال کرنے والا کون ہے ۔ یہ وہ شخص ہے جو موجودہ دنیا میں تین باتوں کا ثبوت دے سکے ۔ ایک وہ جس کو ایمان کہا جاتا ہے ۔ یعنی حقیقت کا شعور اور اس کا اعتراف ۔ دوسرے عمل صالح ۔ یعنی عین وہی کرنا جو کرنا چاہیے اور وہ نہ کرنا جو نہیں کرنا چاہیے ۔ تیسرے حق وصبر کی تواصی ۔ یعنی حقیقت کا ادراک اتنا گہرا ہو کہ آدمی اس کا داعی اور مبلغ بن جائے ۔

ایک تجربہ

گجرات کی ایک مسلم برادری ہے جس کا نام مومن برادری ہے۔ عام طور پر اس کو چلیا برادری کہا جاتا ہے۔ یہ ایک تجارت پیشہ برادری ہے۔ ان کے افراد مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بمبئی میں یہ برادری تقریباً ۲۵ ہزار کی تعداد میں آباد ہے۔

تجارت سے آدمی کے اندر ایک مخصوص کردار پیدا ہوتا ہے۔ یہ کردار اس برادری میں پوری طرح موجود ہے۔ مثلاً، وہ ملازمت کرنے کے بجائے اپنی محنت سے کمانا پسند کرتے ہیں۔ ان کی زندگی نہایت سادہ ہوتی ہے۔ حتی کہ شادیوں میں ان کے یہاں جہیز کا کوئی رواج نہیں۔ وہ سیاسی جھگڑوں سے بالکل دور رہتے ہیں۔ ان کے درمیان باہمی اختلافات دوسرے مسلمانوں کی نسبت سے بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ اور اگر کوئی باہمی اختلاف پیدا ہو جائے تو وہ اپنے بڑوں کے فیصلہ پر راضی ہو کر اختلاف ختم کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے اختلافی معاملات کے لیے کبھی عدالت میں نہیں جاتے۔

چلیا برادری کے اس مزاج کی وجہ سے اس کو دینی فائدہ بھی مل رہا ہے اور دنیوی فائدہ بھی۔ اس کے مزاج کی سادگی، حقیقت پسندی، بات کو مان لینے، کا نتیجہ یہ ہوا کہ تبلیغی تحریک کو اس نے بہت جلد قبول کر لیا۔ تبلیغ میں شامل ہونے سے مزید ان کے اندر اعتماد اور یقین کی نفسیات پیدا ہوئی۔ وہ ترقی کی راہ میں آگے بڑھتے چلے گئے۔

چلیا برادری کی مذکورہ نفسیات کا دوسرا زبردست فائدہ انھیں اتحاد کی صورت میں ملا۔ اس برادری کے لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ بہت جلد تجارتی شرکت کو قبول کر لیتے ہیں۔ ان کی اکثر تجارتیں آپس کے مشترک سرمایہ سے چل رہی ہیں۔ ان کا ایک آدمی کہے گا کہ فلاں ہوٹل دس لاکھ روپے میں بک رہا ہے۔ آؤ ہم مل کر اس کو خرید لیں۔ اس کو نہایت آسانی سے سرمایہ لگانے والے افراد مل جائیں گے اور وہ مشترک سرمایہ سے ہوٹل کو خرید کر اس کو منظم انداز سے چلاتے رہیں گے اور ان کے درمیان کبھی کوئی جھگڑا نہیں پیدا ہوگا۔

موجودہ زمانہ میں کوئی بڑا کام کرنے کے لیے بڑے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ سرمایہ عام طور پر

بینک فراہم کرتے ہیں۔ اسلام میں چونکہ سود کو حرام قرار دیا گیا ہے اس لیے بہت سے "ترقی پسند" یہ کہتے ہیں کہ اسلام اقتصادی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے کیوں کہ اقتصادی ترقی بینک کے سودی قرضوں سے ہوتی ہے اور سودی قرضہ پر کاروبار کرنے کی اسلام میں گنجائش نہیں۔

بمبئی کی چلیا برادری اس الزام کی عملی تردید ہے۔ چلیا برادری کا نمونہ بتاتا ہے کہ اقتصادی عمل کے لیے سودی مالیات لازمی نہیں ہیں۔ یہاں سودی مالیات کا ایک بدل موجود ہے۔ اور وہ ہے مشارکتی مالیات۔ یعنی حصہ داری کی بنیاد پر مشترک سرمایہ فراہم کرنا اور اس کے ذریعہ سے کئی آدمیوں کا مل کر کاروبار کرنا۔

یہ وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانہ میں کوآپریٹو سسٹم کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوآپریٹو نظام سودی نظام کا اسلامی بدل ہے۔ مگر کوآپریٹو نظام کے تحت اقتصادی عمل جاری کرنے کے لیے ایک لازمی شرط ہے اور وہ ہے اتحاد کا مزاج۔ چلیا برادری میں یہ مزاج پوری طرح پایا جاتا ہے اس لیے ان کے درمیان تجارتی مشارکت کامیاب ہے۔ عام مسلمانوں میں یہ مزاج موجود نہیں، اس لیے ان کے یہاں تجارتی مشارکت بھی نہیں پائی جاتی۔

اتحاد و اتفاق ایک ایسی چیز ہے جو ہر اعتبار سے مفید ہے، دین کے اعتبار سے بھی اور دنیا کے اعتبار سے بھی۔ مگر یہی وہ سب سے قیمتی چیز ہے جو آج مسلمانوں میں سب سے کم پائی جاتی ہے۔

زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت قومی مزاج کی ہوتی ہے۔ قوم کے اندر اگر تعمیری مزاج ہو تو اس کا ہر معاملہ اپنے آپ درست ہوتا چلا جائے گا۔ اس کے اندر وہی قیادت ابھرے گی جو واقعۃً صحیح قیادت ہو۔ غیر صالح قیادت اس کے اندر اپنی زمین نہ پا سکے گی۔ اس کے افراد کسی مفید کام کے لیے نہایت آسانی سے متحد ہو جائیں گے۔ دوسری قوموں سے اس کا غیر ضروری ٹکراؤ اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔

قومی مزاج کے صالح ہونے پر ہی قوم کی تمام ترقیوں کا انحصار ہے۔ اور اگر قوم کا مزاج بگڑا ہوا ہو تو ایسی قوم کو کوئی چیز بربادی سے نہیں بچا سکتی۔ اگر آپ کو قوم کی اصلاح کرنی ہو تو اس کے مزاج کی اصلاح کر دیجیے۔ اس کے بعد تمام چیزوں کی اصلاح اپنے آپ ہو جائے گی۔

جوہر شناسی

علامہ ابن قیم (۷۵۱ - ۶۹۱ھ) نے اپنی کتاب طریق الہجرتین میں ایک واقعہ اس طرح نقل کیا ہے:

روی عن عبد العزیز بن ابی حازم عن ابیہ عن سہل بن سعد قال: تلا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قولہ عز وجل: (افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالہا) وغلام جالس عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال: بلی واللہ یارسول اللہ - ان علیہا لاقفالہا - ولا یفتحہا الا الذی اقفلہا - فلما ولی عمر بن الخطاب طلبہ لیستعملہ وقال: لم ذالک الا من عقل (صفحہ ۶۶)

حضرت سہل بن سعد کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سورہ محمد کی یہ آیت تلاوت فرمائی: کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر اس کے تالے پڑے ہوئے ہیں۔ اس وقت ایک لڑکا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے آیت سن کر کہا: ہاں، خدا کی قسم اے اللہ کے رسول بیشک دل پر اس کے تالے ہوتے ہیں۔ اور ان کو کوئی نہیں کھول سکتا سوا اس کے جس نے اس کو لگایا ہے۔ پھر جب حضرت عمر بن خطابؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے اس لڑکے کو بلایا تاکہ اس کو کسی کام پر لگائیں۔ اور انھوں نے کہا: لڑکے نے یہ جو بات کہی وہ عقل سے کہی۔

جو لوگ اجتماعی معاملات کے ذمہ دار ہوں ان کے لیے افراد کی بے حد اہمیت ہوتی ہے۔ کسی ادارہ یا کسی اجتماعی عمل کی حسن کارکردگی کے ضامن ہمیشہ اس کے افراد ہوتے ہیں۔ ایسے افراد ہمیشہ معاشرہ میں موجود رہتے ہیں مگر جن ذمہ داروں کے ہاتھ میں افراد کے انتخاب کی ذمہ داری ہو ان کے اندر ایک صفت لازمی طور پر پائی جانی چاہیے۔ اور وہ یہ کہ وہ آدمی کے جوہر ذاتی کی بنیاد پر اس کا انتخاب کریں نہ کہ کسی اور بنیاد پر۔

ادارہ کے ذمہ دار میں اگر خویش پروری کا جذبہ ہو۔ اگر وہ خوشامدی انسانوں کو پسند کرتا ہو۔ اگر وہ یہ چاہتا ہو کہ اس کے گرد وپیش تمام لوگ اس سے کمتر صلاحیت کے ہوں تاکہ اس کی ذاتی بڑائی قائم رہے، ذمہ دار کے اندر اگر اس قسم کا مزاج ہو تو وہ ادارہ کو بے کار انسانوں کا کباڑخانہ بنا دیگا اس کے برعکس اگر اس کے اندر وہ مزاج ہو جس کا ایک نمونہ اوپر کے واقعہ میں نظر آتا ہے تو اس کا ادارہ ایک ایسا باغ ہوگا جس میں ہر قسم کے بہترین درخت لگے ہوئے ہوں، اور ہمیشہ وہ اپنا پھل دیتا رہے۔

اسلامی حکمراں

صلاح الدین ایوبی (۱۱۳۸-۱۱۹۲) مصری سلطان کی فوج میں معمولی سپاہی تھے۔ اپنے غیر معمولی کارناموں کی وجہ سے وہ ۳۱ سال کی عمر میں مصری افواج کے سپہ سالار مقرر کیے گیے۔ اسی کے ساتھ انھیں مصر کا وزیر بھی بنا دیا گیا اور انھیں مَلِک کا خطاب دیا گیا۔ بعد کو ایک انقلاب کے نتیجہ میں وہ مصر کے خود مختار سلطان ہو گیے۔

یہ وہ وقت تھا جب کہ طویل صلیبی جنگوں کے درمیان یورپ کی مسیحی طاقتوں نے یروشلم (فلسطین) پر قبضہ کر لیا تھا۔ صلاح الدین ایوبی نے مسلم حکمرانوں میں یہ تبلیغ کی کہ وہ اپنی متحدہ کوشش ہی سے مسیحی یلغار کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ مصر، شام وغیرہ ممالک کو متحد کرنے میں کامیاب ہو گیے۔

سلطان صلاح الدین ایوبی نے پوری قوم میں جہادی روح پیدا کر دی۔ انھوں نے زبردست تیاری کے بعد جولائی ۱۱۸۷ء میں حطین (فلسطین) کے مقام پر مسیحی افواج پر حملہ کیا اور ان کو فیصلہ کن شکست دی۔ اس کے بعد سلطان صلاح الدین کی فوجوں نے تیزی سے آگے بڑھنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہ یروشلم تک پہونچ گئیں اور بالآخر یروشلم کو فتح کر کے فلسطین کو دوبارہ اسلامی خلافت کا حصہ بنا دیا۔

تاہم سلطان صلاح الدین کی فوجی کارروائی نمایاں طور پر مسیحی اقوام کی کارروائیوں سے مختلف تھی۔ مسیحی اقوام نے فلسطین پر قبضہ کرنے کے بعد نہایت وحشیانہ انداز میں مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا۔ اس کے برعکس سلطان صلاح الدین ایوبی نے مکمل ضبط سے کام لیا۔ انھوں نے کسی قسم کی انتقامی کارروائی نہیں کی۔ اس سلسلہ میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

> Saladin's crowning achievement and the most disastrous blow to the whole crusading movement came on October 2, 1187, when Jerusalem, holy to both Muslim and Christian alike, surrendered to the Sultan's army after 88 years in the hands of the Franks. In stark contrast to the city's conquest by the Christians, when blood flowed freely during the barbaric slaughter of its inhabitants, the Muslim reconquest was marked by the civilized good faith and courteous behaviour of Saladin and his troops.
>
> *Encyclopaedia Britannica*, 1984 Volume 16, p. 177

صلاح الدین کی شاندار کامیابی اور پوری صلیبی تحریک کی سب سے زیادہ تباہ کن شکست ۲ اکتوبر ۱۱۸۷ء کو ظہور میں آئی جب کہ یروشلم، جو کہ مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کے نزدیک مقدس ہے، وہ ۸۸ برس تک مسیحیوں کے قبضہ میں رہنے کے بعد دوبارہ سلطان کی فوجوں کے قبضہ میں آگیا۔ مسیحیوں نے جب شہر پر قبضہ کیا تھا تو انھوں نے وحشیانہ طور پر اس کے باشندوں کو قتل کیا اور آزادانہ طور پر لوگوں کا خون بہایا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کا دوبارہ قبضہ مہذب انسانوں کا قبضہ تھا، صلاح الدین اور اس کی فوجوں نے مفتوح کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ کیا۔

رعایا کے ساتھ سلطان صلاح الدین ایوبی کا یہ انصاف محض اتفاقی نہ تھا۔ یہ اس کی اسلامیت کا نتیجہ تھا۔ صلاح الدین صرف ایک بہادر اور حوصلہ مند شہسوار ہی نہ تھا۔ وہ ایک خدا ترس اور عبادت گذار آدمی تھا۔ اس کا ذہن اسلامی تعلیمات کے تحت بنا تھا۔

اسلامی تعلیمات کے اثر سے سلطان صلاح الدین کا یہ حال تھا کہ وہ دنیا سے زیادہ آخرت کو اہمیت دیتا تھا۔ وہ اس بات سے ڈرتا تھا کہ قیامت میں اس سے اس کی رعایا کے بارہ میں پوچھ ہوگی۔ اسلام اس کے لیے اس میں مانع بن گیا تھا کہ اس کے اندر گھمنڈ کا مزاج پیدا ہو۔ اس کے برعکس اس کے اندر زہد اور تواضع کا مزاج تھا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے سلطان صلاح الدین کے زہد و تقویٰ کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ---- and on March 4, 1193, he died. While his relatives were already scrambling for pieces of the empire, his friends found that the most powerful and most generous ruler in the Muslim world had not left enough money to pay for his grave. (16/178)

اور ۴ مارچ ۱۱۹۳ء کو صلاح الدین کا انتقال ہوگیا۔ جب کہ اس کے رشتہ دار ابھی سلطنت کے ٹکڑوں کے لیے آپس میں کش مکش کر رہے تھے، اس کے دوستوں نے پایا کہ مسلم دنیا کے سب سے زیادہ طاقت ور اور سب سے زیادہ فیاض حکمراں نے اپنے پیچھے اتنی رقم بھی نہیں چھوڑی ہے جو اس کی قبر کے اخراجات کو پورا کر سکے۔

مواقع کا استعمال

اسلامی تاریخ میں صلح حدیبیہ کا واقعہ اجتماعی حکمت کی ایک عظیم الشان مثال ہے۔ مکہ کے قریش نے اگرچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی سخت مخالفت کی۔ مگر شروع ہی سے ان کے درمیان ایک عنصر موجود تھا جو یہ چاہتا تھا کہ ہم محمدؐ سے براہ راست نہ ٹکرائیں۔ بلکہ ان کا رُخ دوسرے عرب قبائل کی طرف پھیر دیں۔

مکہ کے سرداروں میں ایک ممتاز سردار عُتبہ بن ربیعہ تھا۔ ہجرت سے قبل کا واقعہ ہے کہ قریش نے ایک بار عُتبہ کو اپنا نمائندہ بنا کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا۔ اس ملاقات کا تفصیلی بیان سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ عُتبہ جب آپ سے گفتگو کے بعد واپس آیا تو اس نے قریش سے کہا:

یامعشر قریش اطیعونی وخلوا بین ھذا الرجل وبین ماھو فیہ فاعتزلوہ۔ فاِن تُصِبْہُ العرب فقد کُفیتُموہُ بغیرکم وان یَظْھَرْ علی العرب فملکہ ملککم وعِزُّہ عزکم

(سیرت ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۳۱۴)

اے قریش کے لوگو، میری بات مانو اور اس آدمی کے درمیان اور جس میں وہ ہے اس کے درمیان حائل نہ ہو۔ اور اسے چھوڑ دو۔ اگر عرب اس سے نمٹ لیں تو وہ تمہارے لیے کافی ہوگیے۔ اور اگر وہ عرب پر غالب آگیا تو اس کی حکومت تمہاری حکومت ہے اور اس کی عزت تمہاری عزت ہے۔

اسی طرح ہجرت کے بعد جب قریش رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ بدر چھیڑنے کے لیے نکلے تو راستہ میں آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ اس وقت عتبہ نے قریش کے ایک گروہ کی نمائندگی کرتے ہوئے مکہ والوں سے کہا:

یامعشر قریش، انکم واللہ ماتصنعون بان تلقوا محمّداً واصحابہ شیئاً۔ واللہ لئن اصبتموہ لایزال الرجل ینظر فی وجہ رجل یکرہ النظر الیہ ـــــ قتل ابن عمہ او ابن خالہ اورجلا من عشیرتہ۔

اے قریش کے لوگو، خدا کی قسم محمد اور ان کے اصحاب سے ٹکرا کر تم کچھ بھی حاصل نہ کر سکوگے۔ خدا کی قسم اگر ان سے تمہاری مڈبھیڑ ہوئی تو ہمارے ہر آدمی کے سامنے کسی ایسے آدمی کا چہرہ ہوگا جس کو قتل کرنا اُسے پسند نہ ہو۔ یعنی چچا کا لڑکا، ماموں کا لڑکا یا اپنے قبیلہ

فارجعوا وخلّوا بين محمدٍ وبين سائر العرب۔ فان اصابوه فذالك الذی اردتم وان کان غیر ذالك الفاکم ولم تعرضوا منه ما تریدون

(سیرت ابن ہشام، الجزء الثانی، صفحہ ۲۶۳)

کا کوئی آدمی۔ اس لیے تم لوٹ چلو اور محمد اور عرب قبائل کے درمیان سے ہٹ جاؤ۔ اگر اہل عرب محمد پر غالب آگیے تو یہ وہی ہوگا جو تم چاہتے ہو۔ اور اگر محمد عرب قبائل پر غالب آگیے تو محمد تم کو اس حال میں پائیں گے کہ تم نے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی ہوگی (تمہاری پوزیشن محفوظ ہوگی)

موجودہ دنیا امتحان اور مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں یہ ممکن نہیں کہ فریق ثانی کو عین اپنی پسند کی شرطوں پر راضی کیا جا سکے۔ بیشتر حالات میں خود اپنے آپ کو فریق ثانی کی شرطوں پر راضی کرنا پڑتا ہے۔

یہی آدمی کی حکمت اور تدبیر کا امتحان ہے۔ یہاں یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ فریق ثانی کی شرطوں میں کہاں وہ گنجائش ہے جس کو مان کر ہم اپنے لیے مستقبل کی تعمیر کا راستہ نکال سکتے ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے موقع پر یہی کیا۔ آپ نے کمال دانش مندی کے ساتھ قریش کے مذکورہ ذہن کو سمجھا اور اس کو انتہائی حکمت کے ساتھ استعمال کیا۔ چنانچہ حدیبیہ کے مقام پر جب قریش نے آپ کو آگے بڑھنے سے روک دیا، اس وقت آپ نے قریش کو جو پیغام بھیجا اس میں یہ الفاظ بھی شامل تھے :

انا لم نجئ لقتال احد ولکن جئنا معتمرین۔ وانّ قریشًا قد نهکتهم الحرب واضرّت بهم فان شاؤا ماددتهم مدةً ويخلّوا بيني وبين الناس۔ فان اَظهر فاِن شاؤا اَن یدخلوا فیما دخل فیه الناس فعلوا وّالّا فقد جمّوا۔

ہم کسی سے لڑنے کے لیے نہیں آئے ہیں۔ بلکہ ہم عمرہ کرنے کے لیے آئے ہیں۔ اور جنگ نے قریش کا برا حال کر رکھا ہے اور ان کو سخت نقصان پہونچایا ہے۔ اگر وہ چاہیں تو میں ان کے لیے ایک مدت (صلح کی) مقرر کر دوں اور وہ میرے اور دوسرے عرب قبائل کے درمیان سے ہٹ جائیں۔ اگر میں غالب رہا تو وہ چاہیں تو اس دین میں داخل ہو جائیں گے جس میں لوگ داخل ہوئے ہیں۔ اور اگر میں غالب نہ ہوا تو ان کا مدعا حاصل ہے۔

فتوحات کا راز

یورپ کے ملک اسپین اور افریقہ کے ملک مراکو کے درمیان ایک سمندری پٹی ہے جس کی چوڑائی بعض مقامات پر صرف ۸ میل ہے۔ یہاں اسپین کی جانب دو ساحلی مقامات کے نام یہ ہیں: طریفہ (Tarifa) اور جبرالٹر (Gibraltar)۔ یہ دونوں اسپینی شہر دو مسلم سرداروں کے نام پر ہیں۔ جن میں سے ایک کا نام طریف اور دوسرے کا نام طارق تھا۔ یہ دونوں مسلم سردار ۷۱۱ء (۹۲ھ) میں مراکو (مراکش) کے راستے سے کشتیوں کے ذریعہ اسپین میں داخل ہوئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اسپین میں شاہ لرزیق (King Roderick) کی حکومت تھی۔ بادشاہ کے مظالم سے بگڑ کر خود اسپین کے لوگوں نے مسلمانوں کو اسپین پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ چنانچہ مسلمانوں کی فوج جو ابتداءً اسپین میں داخل ہوئی اس کے ساتھ ایک اسپینی سردار کاؤنٹ جولین (Count Julian) بھی شامل تھا اور مسلمانوں کی رہنمائی کر رہا تھا۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے اعتراف کیا ہے کہ ــــ اسپین پر مسلمانوں کا حملہ گاتھ لوگوں کی دعوت کا نتیجہ تھا نہ کہ مسلمانوں کا اپنا اقدام:

> But the Muslim invasion of Spain was the result of Visigoth invitation rather than Muslim initiative (17/414).

اسپین کے لوگ بادشاہ کے مظالم سے تنگ آچکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اسپینی باشندوں نے تعجب خیز طور پر طارق ابن زیاد کی رضاکارانہ اطاعت قبول کرلی:

> Much to his surprise, many Spaniards submitted to him voluntarily (17/414).

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے مزید لکھا ہے کہ مسلمانوں کی فتح نے اسپینی سماج کے بہت سے عناصر کو فائدہ پہونچایا۔ ٹیکسوں کا بوجھ مجموعی طور پر اس سے کم سخت ہوگیا جو گاتھ عہد کے آخری برسوں میں اسپین میں تھا۔ غلام مزدور جنھوں نے اسلام قبول کرلیا تھا ان کو آزاد حیثیت حاصل ہوگئی۔ یہود اب ستائے نہیں جارہے تھے اور انھیں اب دوسرے اسپینی فرقوں کے برابر کا درجہ

حاصل تھا۔ اس طرح آٹھویں صدی کے نصف اول میں اسپین میں ایک نیا اور بالکل مختلف سماج پیدا ہو گیا:

The Muslim conquest brought advantages to many elements of society: the burden of taxes was on the whole less onerous than it had been in the last years of the Visigoth epoch; serfs who converted to Islam advanced into the category of freedom; Jews were no longer persecuted and were placed on an equal footing with the Hispano-Romans and Goths. Thus, in the first half of the 8th century, there was born a new quite different society in Muslim Spain (17/414).

یہاں جو بات اسپین کے مسلم عہد کے بارے میں کہی گئی ہے وہی مسلمانوں کی دوسری فتوحات کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں مسلمان جس طرح دنیا کے بڑے حصہ پر چھا گئے اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ ممالک اپنے ملکی حکمرانوں کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ وہ کسی نئے نجات دہندہ کے انتظار میں تھے۔ چنانچہ انھوں نے ہر جگہ مسلمانوں کو خوش آمدید کہا۔ بادشاہوں سے ضرور مسلمانوں کی لڑائیاں ہوئیں مگر ان ملکوں کے عوام کے دل اکثر مقامات پر مسلمانوں کے ساتھ تھے انھوں نے نہایت آسانی سے ہر جگہ مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی۔

اسپین کا آٹھ سو سالہ مسلم عہد تہذیب کی تاریخ میں انتہائی شاندار عہد تھا۔ مسلمانوں نے اس دور میں ہر اعتبار سے اعلیٰ ترین مثال قائم کی۔ کسی عیسائی پر کبھی مذہب کی بنیاد پر ظلم نہیں کیا گیا۔ جن لوگوں نے اسلام قبول کیا، اسلام کی خوبیوں سے آگاہ ہو کر آزادانہ طور پر کیا۔ انصاف کا حال یہ تھا کہ سلطان عبدالرحمٰن ثانی پر ایک عیسائی نے قاضی کے یہاں دعویٰ دائر کیا اور سلطان کو ایک عام آدمی کی طرح قاضی کی عدالت میں جانا پڑا۔

مسلمانوں نے تمام ملک میں سڑکوں اور نہروں کا جال بچھا دیا۔ جگہ جگہ پل بنائے گئے۔ تعلیم، تعمیر، معدنیات، زراعت، باغبانی، جہازرانی، صنعت، غرض کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس میں انھوں نے اسپین کو غیر معمولی ترقی نہ دی ہو۔

مگر تعصب اندھا ہوتا ہے، مسیحی لوگ تعصب کی بنا پر مسلمانوں کے دشمن ہو گئے۔ اس کی قیمت انھیں یہ دینی پڑی کہ اسپین پھر دوبارہ ترقی نہ کر سکا۔ مسلمانوں کی تاریخ ختم کرنے کی کوشش میں ان کی اپنی تاریخ بھی ختم ہو گئی۔

الرسالہ (انگریزی)

الرسالہ (اردو) ۱۹۷۶ میں نکلنا شروع ہوا تھا۔ اس کا انگریزی اڈیشن فروری ۱۹۸۴ سے نکل رہا ہے اور ہر ماہ پابندی کے ساتھ خریداروں کے پاس پہنچ رہا ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کو اللہ کے فضل سے ملک کے اندر اور ملک کے باہر غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اہل زبان انگریزی دانوں نے اس کی زبان کی خوبی کا اعتراف کیا ہے اور اس کے لسانی اور علمی معیار کو سراہا ہے۔

مسلم دنیا میں بہت سے انگریزی رسالے اور اخبارات شائع ہو رہے ہیں۔ بظاہر ان کے نام مختلف ہیں۔ تاہم اگر مضامین کے اعتبار سے ان کا کوئی ایک مشترک نام رکھنا ہو تو وہ پروٹسٹ (احتجاج) ہوگا۔ ان جرائد کو دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ان کے پاس اپنے مفروضہ دشمنوں کے خلاف شکایت اور احتجاج کے سوا کوئی اور لکھنے کی چیز نہیں۔ انھوں نے نہ خدا کو پایا جس کی وہ کبریائی بیان کریں۔ ان کو نہ جہنم کی لپٹیں محسوس ہوئیں جس کی وہ دنیا کو خبر دیں۔ ان کو نہ جنت کے کسی جھونکے کا تجربہ ہوا جس کو وہ خدا کے بندوں تک پہنچائیں۔ ان کو بس ایک ہی چیز معلوم ہے۔ اور وہ مسلمانوں کے قومی مسائل ہیں اور وہ انھیں کو دہراتے رہتے ہیں۔

مسلمانوں کے جرائد ساری دنیا میں ایک قسم کا احتجاج نامہ بن کر رہ گئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک عام انسان کو اس میں پڑھنے کی کوئی چیز ملتی ہی نہیں۔ عام انسان جو اپنی فطرت کے زور پر سچائی کی تلاش میں ہے اس کو مسلمانوں کی قومی چیخ پکار سے کیا تعلق۔ نتیجہ یہ ہے کہ بظاہر اگرچہ مسلمانوں کے بہت سے انگریزی جرائد ساری دنیا میں نکل رہے ہیں مگر دین حق کے تعارف کے اعتبار سے ان کی کوئی افادیت نہیں۔

الرسالہ (انگریزی) مسلم دنیا میں غالباً پہلا رسالہ ہے جو لوگوں کے سامنے اسلام کا مثبت تعارف پیش کرتا ہے جو احتجاج اور شکایت سے بلند ہو کر انسان کو برتر سچائیوں کی طرف بلاتا ہے۔ جو انسان کی ابدی فطرت کا ترجمان ہے نہ کہ کسی قوم کے وقتی مسائل کا ترجمان۔

ایسے ایک پرچہ کا وجود میں آنا آپ پر زبردست ذمہ داری ڈالتا ہے۔ وہ یہ کہ آپ اس کے ساتھ تعاون کریں۔ آپ اس کی ایجنسی لیں۔ آپ لوگوں کو اس کا خریدار بنائیں۔ اس کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لئے آپ اپنی ساری طاقت لگا دیں۔

منیجر الرسالہ (انگریزی)

والدہ کا انتقال

۸ اکتوبر ۱۹۸۵ کو میری والدہ زیب النساء کا انتقال ہوگیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے موت کے لمحات کو اپنی آنکھ سے دیکھا۔

میرے والد جناب فرید الدین خاں صاحب کا انتقال ۲۴ دسمبر ۱۹۲۹ کو ہوا تھا۔ اس وقت میری عمر صرف پانچ سال تھی۔ والد مرحوم کے انتقال کے ۵۵ سال بعد میری والدہ کا انتقال ہوا۔ اپنی تقریباً سو سالہ عمر کا بیشتر حصہ انھوں نے میرے بڑے بھائی عبد العزیز خاں صاحب (چیرمین لائٹ اینڈ کمپنی لمیٹڈ، الہ آباد) اور میرے چھوٹے بھائی عبد المحیط خاں (جوائنٹ ڈائرکٹر ٹکنکل ایجوکیشن۔ یوپی) کے ساتھ گزارا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ آخری ڈیڑھ سال وہ میرے ساتھ دہلی میں رہیں۔

والدہ کو مجھ سے بہت زیادہ تعلق تھا۔ غالباً اپنے بچوں میں وہ مجھ کو سب سے زیادہ مانتی تھیں۔ اکثر اپنا ایک خواب بڑے شوق سے بیان کرتی تھیں۔ جب میں پیٹ میں تھا تو آخری دنوں میں والدہ نے رات کو خواب دیکھا کہ میری پیدائش ہوئی ہے۔ اس کے بعد ہی ایک بڑا سا ہاتھی آتا ہے۔ وہ مجھ کو سونڈ سے اٹھا کر اپنی پیٹھ پر رکھتا ہے اور مجھ کو لے کر چلا جاتا ہے۔ والدہ خواب میں کہہ رہی ہیں ــــ "دیکھو اتنا اچھا لڑکا تھا اس کو ہاتھی اٹھا لے گیا" اسی رات کے بعد آنے والی صبح کو میری پیدائش ہوئی۔ والدہ یہ خواب بیان کرکے مسکراتیں اور کہتیں کہ "پتہ نہیں اس خواب کا کیا مطلب ہے"

والدہ معمولی پڑھی ہوئی تھیں۔ تاہم ان کو میرے کام سے بہت گہرا قلبی تعلق تھا۔ وہ الرسالہ پڑھوا کر سنتیں اور دعا دیتیں۔ الرسالہ کیسٹ بن کر آیا تو اس کو بھی منگوا کر سنا اور اس کو سن کر بہت خوش ہوئیں۔

۲۹ نومبر ۱۹۶۸ کو میں نے دہلی میں خواب دیکھا تھا کہ ایک بڑی سی ٹوکری ہے۔ میں نے اس میں مختلف قسم کے پھل کاٹ کاٹ کر رکھے۔ اس کے بعد لوگ کھانے کے لیے جمع ہوئے۔ یہ سب زیادہ تر میرے اپنے خاندان کے لوگ ہیں اور والدہ بھی ان کے ساتھ موجود ہیں۔ پھلوں کی ٹوکری درمیان میں رکھی ہے اور کنارے کنارے لوگ بیٹھ کر کھا رہے ہیں۔ اس درمیان میں والدہ نے پھلوں کی ٹوکری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا :

"وحید کا خیال ہے کہ اس کا کوئی عالمی مرکز قائم کرے"

خواب میں اس جملہ کا مطلب ذہن میں یہ ہے کہ پھلوں (دین رحمت) کی ایسی دعوت ترتیب دی جائے جس سے سارے عالم کے لوگ رزق حاصل کر سکیں۔

والدہ مرحومہ میرے بھائیوں کے پاس ہر طرح سکون اور آرام کے ساتھ تھیں۔ وہ لوگ مجھ سے کہیں زیادہ ان کی خدمت کر سکتے تھے اور کر رہے تھے۔ مگر آخر عمر میں ان کی بہت زیادہ خواہش ہوئی کہ وہ اپنی زندگی کا بقیہ حصہ میرے پاس گزاریں۔ میرے بارہ میں والدہ مرحومہ کا خیال تھا کہ میں ان کا اللہ والا لڑکا ہوں۔ وہ اکثر مجھ کو "اللہ والے وحید" کہتی تھیں۔ اس بنا پر ان کی دلی خواہش تھی کہ ان کی آخری رسوم میرے ہاتھ سے ادا ہوں۔

۳۰ اپریل ۱۹۸۴ کو میں نے گونڈہ (یوپی) کا ایک سفر کیا تھا اور وہاں ۲ مئی ۱۹۸۴ تک رہا۔ اس سفر کی روداد الرسالہ ماہ نومبر ۱۹۸۴ میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ سفر دراصل والدہ سے ملاقات کے لیے تھا۔ باربار والدہ کا پیغام آتا تھا کہ وہ مجھ کو دیکھنا چاہتی ہیں چنانچہ میں اپنے عزیز جناب یمین الاسلام خاں صاحب (انجینیر) کے ساتھ گونڈہ گیا اور وہاں والدہ کے ساتھ تین دن رہا۔

والدہ باربار کہتی تھیں کہ مجھے دہلی لے چلو۔ میں چاہتی ہوں کہ میرا آخری وقت تمہارے ساتھ گزرے۔ مگر میں ہر بار یہی کہتا رہا کہ یہاں آپ کو زیادہ آرام ہے، آپ یہیں رہیے۔ میں والدہ سے معذرت کر کے دہلی آگیا۔ مگر صبح و شام مجھے ان کی بات یاد آتی تھی۔

واپسی کے دو دن بعد میں صبح کو نظام الدین (دہلی) میں اپنے مکان کی چھت پر ملحقہ پارک کی طرف رُخ کیے ہوئے کھڑا تھا اور بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اتنے میں میری اہلیہ وہاں آگئیں۔ میری حالت دیکھ کر پوچھنے لگیں کہ کیا بات ہے۔ میں نے کہا کہ "والدہ یہاں آنا چاہتی تھیں اور میں ان کو نہیں لایا۔ اگر ان کا انتقال ہو گیا تو یہ گھر مجھے کاٹے گا"۔ اہلیہ نے کہا کہ پھر اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ میں جا کر انھیں یہاں لاتی ہوں۔

اس کے بعد میں نے اپنے گھر کے سب لوگوں کو جمع کیا۔ میں نے کہا کہ تم سب لوگ ایک بات کا عہد کرو تب والدہ کو یہاں بلایا جا سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ بوڑھے اور بیمار لوگوں کے اندر ہمیشہ جھنجھلاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ والدہ آئیں گی تو یقیناً ان کی طرف سے ناخوش گواری کی باتیں پیش آئیں گی۔ مگر

تم لوگوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کرنا ہے۔ وہ خواہ کچھ بھی کہیں، مگر تم لوگوں کو کچھ بھی نہیں بولنا ہے۔ سب نے مل کر عہد کیا کہ وہ ایسا ہی کریں گے۔

اس کے بعد میں نے اہلیہ اور اپنے لڑکے ثانی اثنین کو گونڈہ بھیجا جہاں والدہ اس وقت میرے چھوٹے بھائی کے ساتھ مقیم تھیں۔ وہ لوگ والدہ کے راحت و آرام کا پورا لحاظ کرتے ہوئے ان کو نہایت اہتمام کے ساتھ دہلی لے آئے۔ اس طرح وہ ۸ مئی ۱۹۸۴ کو گونڈہ سے دہلی آئیں اور ڈیڑھ سال بعد ۸ اکتوبر ۱۹۸۵ کو اس دنیا سے چلی گئیں۔

عجیب بات ہے کہ ۱۹۸۰ کے آغاز میں میں نے والدہ کے بارہ میں ایک خواب دیکھا تھا جو میری ڈائری میں نوٹ ہے۔ میں نے دیکھا کہ قیامت کا میدان ہے اور میں والدہ کا ہاتھ پکڑ کر انھیں لے جا رہا ہوں۔ ہمارے آگے آگے روشنی ہے۔ اس خواب کا مطلب غالباً یہی تھا کہ والدہ کا آخری سفر میرے یہاں سے ہوگا اور میں ان کے جسد خاکی کو اٹھا کر قبر کی طرف لے جاؤں گا۔ جو گویا اگلی دنیا میں داخلہ کا دروازہ ہے۔

والدہ کے دہلی آنے سے پہلے میں اکثر ان کو خواب میں دیکھتا تھا۔ یہ شاید قدرت کی طرف سے اشارہ تھا کہ مجھے ان کو دہلی لانا چاہیے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے ایسے حالات پیدا کیے کہ میں ان کو دہلی لا سکا۔ ان کو مجھ سے خصوصی تعلق تھا۔ وفات کے بعد بھی کئی بار ایسا ہوا کہ مجھے بالکل والدہ کی محبت بھری آواز میں سنائی دیا "وحید" میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ میرے اپنے ذہن کا ٹیپ بج رہا تھا یا والدہ کی روح مجھے پکارتی ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔

والدہ نہایت مضبوط اعصاب کی خاتون تھیں۔ وہ جس مجلس میں رہتیں اپنے قوت کلام سے چھا جاتیں۔ آخر عمر میں اگرچہ ان کو بعض بیماریاں لاحق ہو گئی تھیں، مگر ان کے اکثر اعضاء کان، آنکھ، حافظہ، وغیرہ خدا کے فضل سے آخر وقت تک محفوظ تھے۔ ان کا معدہ بھی کافی حد تک درست تھا۔ اپنی اکثر ضروریات وہ خود سے پوری کر لیتی تھیں۔

والدہ میرے پاس نہایت خوش تھیں۔ ذاتی طور پر مجھ سے انھیں کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ میرے بارہ میں وہ کہا کرتی تھیں کہ تمہارا مزاج بچپن سے نہایت عجیب تھا۔ مثلاً میں نے والدہ سے

کبھی کسی چیز کی فرمائش نہیں کی۔ جب میں مدرسہ (الاصلاح اعظم گڈھ) میں پڑھتا تھا اور جمعہ کی تعطیل میں گھر آتا تو والدہ کے بیان کے مطابق میں نے کبھی ان سے یہ نہیں کہا کہ آج فلاں کھانا پکائیے۔ وہ اکثر مجھ سے پوچھتیں کہ تمہارے لیے کیا چیز پکاؤں۔ مگر میں ہمیشہ یہی جواب دیتا کہ جو چاہے پکائیے سب ٹھیک ہے۔

تاہم قدرتی طور پر میرا یہ جی چاہتا تھا کہ اس آخر عمر میں میں ان سے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی معافی مانگ لوں۔ مگر اس خیال سے چپ رہتا کہ وہ شاید سوچیں کہ میری زندگی کی طرف سے اب یہ لوگ مایوس ہوگئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی ایسی ہوئی کہ یکم اکتوبر کو جب کہ میں ان کی چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا غیر متوقع طور پر انھوں نے خود یہ کہا کہ تم لوگ مجھے معاف کردو۔ اس طرح مجھے موقع مل گیا۔ میں نے فوراً کہا کہ ماں باپ کی کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ غلطی ہمیشہ لڑکوں کی ہوتی ہے۔ اس لیے آپ ہم لوگوں کو معاف کردیں۔ تقریباً آدھ گھنٹے تک میں ان سے معافی مانگتا رہا اور وہ بار بار سب معاف ہے، سب معاف ہے کہتی رہیں۔ وفات کے بعد ۱۲ اکتوبر کی رات کو میں نے خواب میں والدہ کو دیکھا وہ بہت خوش اور تندرست تھیں اور میری ضروریات کا سامان کرنے میں منہمک تھیں۔ اس خواب کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ ان کی روح مجھ سے خوش ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ معافی مانگنے کے صرف دو دن بعد ۳ اکتوبر کو ان پر خاموشی طاری ہوگئی اور پھر وہ کبھی نہیں بولیں۔ وہ اب بھی کسی حد تک سنتی اور سمجھتی تھیں مگر بولنا تقریباً بند ہوگیا۔ چونکہ اس قسم کی خاموشی یا نیم بے ہوشی کی کیفیت اس سے پہلے کئی بار ہوچکی تھی اور پھر وہ ٹھیک ہوگئی تھیں اس لیے ہم لوگ سمجھے نہیں کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ علاج شروع کیا گیا تو اس سے فائدہ بھی محسوس ہوا۔ ہم لوگ اس امید میں تھے کہ پہلے کی طرح چند دن کے بعد وہ اچھی ہوجائیں گی مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔

چار دن تک وہ خاموش حالت میں پڑی رہیں۔ چائے وغیرہ کے لیے پوچھا جاتا تو ہاتھ یا سر کے اشارہ سے ہاں یا نہیں کردیتیں۔ یہاں تک کہ ۸ اکتوبر کی صبح کو ۸ بجے ان کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ یہ موت سے پہلے کی غشی تھی۔ یہ غشی گویا قدرت کی طرف سے ایک عمل تخدیر (Anesthesia) تھا تاکہ موت کی تکلیف کو ان کے لیے آسان کردے۔

موت سے ایک دن پہلے میں نے رات کو تین بجے خواب دیکھا کہ ہمارے مکان کے دروازہ کی گھنٹی

بجی مگر قبل اس کے کہ دروازہ کھولا جائے ایک اجنبی آدمی اندر داخل ہوا اور سیڑھیاں چڑھ کر والدہ کے کمرہ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ یہ آدمی سفید لباس میں تھا۔ اس خواب کے بعد میری نیند کھل گئی۔ میں نے فوراً اٹھ کر والدہ کو دیکھا تو وہ سو رہی تھیں۔ اسی رات کو فجر سے کچھ پہلے والدہ کی سانس اکھڑ گئی۔ اس کے بعد کبھی اکھڑی سانس آتی اور کبھی ٹھیک ہو جاتی۔ ۸ اکتوبر کو فجر کی نماز کے بعد میں والدہ کے کمرہ میں گیا تو سانس زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ چنانچہ میں ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ان کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ تقریباً دو گھنٹہ تک غیر معمولی طور پر تیز سانس آتی رہی۔ ۸ بجے زور سے ایک ہچکی آئی۔ اس کے بعد اسی طرح دوبار اور ہچکی آئی اور اچانک سانس بند ہو گئی۔ میں نے فوراً اپنے لڑکے ثانی اثنین کو بلایا۔ انھوں نے نبض اور آنکھ دیکھی۔ اس کے بعد وہ کچھ بول نہ سکے۔ تاہم ان کا چہرہ خاموش زبان میں کہہ رہا تھا۔

"دادی کا انتقال ہو چکا ہے"

آخر وقت تک مجھے یقین نہیں تھا کہ یہ والدہ کا آخری وقت ہے۔ تاہم جب معلوم ہو گیا کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے تو میں نے والدہ کے ہاتھ اور پاؤں سیدھے کیے۔ ان کی آنکھ کو اور منھ کو بند کیا۔ ان کا پُر رونق چہرہ اب بھی ویسا ہی تھا۔ مگر اس میں سے جان نکل چکی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر میں ان کی زندگی کو دوبارہ لوٹانا چاہوں تو میں ہرگز نہیں لوٹا سکتا۔ موت کے فیصلہ کو بدلنا کسی بھی شخص کے لیے ممکن نہیں۔ یہ تمام تر خدا کے اختیار میں ہے کہ وہ جب تک چاہے کسی کو زندہ رکھے اور جب چاہے اُس کو اِس دنیا سے اٹھا لے۔

انتقال کے فوراً بعد بڑے بھائی کو ٹیلی فون کرنے کی کوشش کی گئی اور چھوٹے بھائی کو ارجنٹ تار دیا گیا۔ مگر ٹیلی فون پر ربط قائم نہ ہو سکا اور تار کافی دیر بعد پہونچا۔ ہندستان ایک طرف الکٹرانک دور میں داخل ہو رہا ہے، دوسری طرف وہ معمولی تار اور ٹیلی فون کے دور میں بھی داخل نہ ہو سکا۔

نماز جنازہ نظام الدین (نئی دہلی) میں ہوئی۔ تبلیغی جماعت کے بزرگ حضرت مولانا اظہار الحسن صاحب قبلہ نے نماز پڑھائی۔ میرے اعزہ کے علاوہ تبلیغی مرکز کے کافی لوگ جنازہ میں شریک تھے۔ تقریباً ایک ہزار آدمیوں کی جماعت ہوئی۔

نماز جنازہ سے پہلے حضرت مولانا اظہار الحسن صاحب نے ایک مختصر تقریر فرمائی۔ یہ تقریر اس وقت بے حد موثر ثابت ہوئی۔ حضرت مولانا نے ہماری فرمائش پر بعد کو یہ تقریر قلم بند کرا دی۔ وہ

انھیں کے اپنے لفظوں میں مکمل طور پر یہاں نقل کی جاتی ہے۔

تقریر حضرت مولانا اظہار الحسن صاحب

"آپ حضرات اور ہم مولانا وحید الدین خاں صاحب کی والدہ ماجدہ کے جنازہ میں شرکت کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ مولانا وحید الدین خاں کی والدہ کا جنازہ ہے۔ حالاں کہ یہ سوچ غلط ہے بلکہ یہ جنازہ ہمارا اور آپ کا اور پورے انسانوں کا ہے۔ اور یہ جنازہ بتا رہا ہے کہ یہ وقت سب پر آرہا ہے۔ امیر ہو کہ غریب، کالا ہو کہ گورا، عربی ہو کہ عجمی، کوئی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ آج آپ اس جنازہ کی نماز پڑھنے کے لیے آئے ہیں کل دوسرے لوگ آپ کی نماز جنازہ پڑھنے کے لیے آئیں گے۔ آج آپ اس جنازہ کو کاندھا دے رہے ہیں اور کل کو دوسرے لوگ آپ کی لاش کو اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوں گے۔ یہ جنازہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے:

واذا حملت الی القبور جنازۃً　　فاعلم بانّك بعدَها محمول

یہ مسہری جس پر مولانا کی والدہ آرام فرمارہی ہیں اس کے پائے پائے سے آواز آرہی ہے:

انظر الیّ بعقلك انا المهیأ لنقلك　　انا سریر المنایا کم سار مثلی بمثلك

یہ مسہری کہہ رہی ہے کہ اپنی عقل کی آنکھیں کھول اور غفلت کی چادر ہٹا اور دیکھ کہ مجھ کو تیرے مکان سے گور غریباں پہونچانے کے لیے ہی بنایا گیا ہے۔ میں موت کی مسہری ہوں۔ میری جیسی کتنی مسہریوں نے تجھ جیسے کتنے انسانوں کو گورستان میں پہونچا دیا ہے۔ ایک مرتبہ ایک بزرگ حضرت عبدالرحمٰن بن شخیر تشریف لے جارہے تھے۔ سامنے سے ایک جنازہ گزر رہا تھا۔ ایک راہ گیر نے حضرت سے پوچھا کہ حضرت کس کا جنازہ ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ بھئی آپ ہی کا تو ہے۔ اس آدمی کو یہ بات ناگوار گزری اور کہنے لگا۔ "واہ جی میرا کیوں ہونے لگا" فرمایا بھیا تمہارا نہیں تو میرا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جنازہ کو دیکھ کر یہ پوچھنا بیکار ہے کہ کس کا ہے۔ بلکہ جنازہ کو دیکھ کر یہ غور کرنا چاہیے کہ یہ وقت خود ہم پر آرہا ہے اور بہت جلد آرہا ہے اس کے لیے تیاری کرنی چاہیے۔ ہماری اس مسجد سے یہی آواز لگائی جارہی ہے کہ مرنے کے بعد کی زندگی کے لیے تیاری کی جائے اور ہر شخص اس کی فکر کرے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ آواز عالم کے گوشہ گوشہ میں پہونچ رہی ہے اور دنیا کے گوشہ گوشہ سے آدمی اپنی آخرت کی تیاری کے لیے آرہے ہیں اور تیاری کر رہے ہیں۔ ہماری بستی والوں سے بھی درخواست ہے کہ مسجد کی آواز کو آکر سنیں اور آخرت کی تیاری میں حصہ لیں۔"

مولانا اظہار الحسن صاحب قبلہ کا مزاج تقریر وغیرہ کا نہیں ہے۔ یہ ان کے معمول کے لحاظ سے ایک خلاف توقع بات تھی۔ حتیٰ کہ وہ مسجد اور مدرسہ سے باہر بھی بہت کم جاتے ہیں۔ تاہم حضرت مولانا کی یہ تقریر اس موقع پر بے حد موثر ثابت ہوئی۔ گویا کہ ماحول چارج ہو گیا۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا کہ لوگ اس حقیقی کیفیت کے ساتھ نماز جنازہ ادا کر رہے ہیں جیسا کہ فی الواقع ادا کرنا چاہیے۔ مولانا اظہار الحسن صاحب کے بروقت کلمات نے نماز جنازہ کو واقعی نماز جنازہ بنا دیا۔

والد کے انتقال کے وقت والدہ کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ والد کے بعد بھی وہ ۵۵ سال تک زندہ رہیں۔ تاہم انھوں نے صرف بچوں کے خیال سے دوسری شادی نہیں کی۔ غالباً یہی وجہ تھی جس کی بنا پر والدہ کے مزاج میں کسی قدر سختی اور جھنجھلاہٹ آگئی تھی۔ چنانچہ بعض اوقات لوگوں کو ان سے شکایت ہو جاتی تھی۔ مگر ان کا باطن بہت صاف و شفاف تھا۔ وہ نہ صرف نماز روزہ کی سختی سے پابند تھیں بلکہ دل کے اعتبار سے پورے معنوں میں مومنہ اور مسلمہ تھیں انھوں نے جان بوجھ کر کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہونچائی اور نہ کبھی جان بوجھ کر کسی کی بدخواہی کی۔

والدہ کا ایک مزاج یہ تھا کہ وہ اپنا کام ہمیشہ خود کرنا پسند کرتی تھیں۔ جب وہ تندرست اور طاقتور تھیں تو بڑے بڑے کام بھی تنہا کر ڈالتی تھیں۔ بعد کو جب وہ کمزور ہو گئیں اس وقت بھی ان کا یہ مزاج باقی رہا۔ ہم لوگ بہت کہتے کہ آپ کو جو کام یا ضرورت ہو اس کے لیے کہہ دیا کریں۔ مگر بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ وہ اپنے کسی کام کے لیے دوسرے سے کہیں۔ اسی مزاج کی وجہ سے بڑھاپے کی عمر میں کئی بار ایسا ہوا کہ وہ کسی کام کے لیے اٹھیں اور پھر گر پڑیں۔ پھر بھی ان کا یہ مزاج آخر عمر تک باقی رہا۔

والدہ کی محبوب دعاؤں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اللہ انھیں چلتی پھرتی حالت میں اٹھا لے۔ ان کی یہ دعا بھی اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی۔ آخری چند دن کے سوا وہ اپنا سب کام خود کرتی رہیں۔ آخر میں اگرچہ وہ پاؤں سے چلنے سے معذور ہو گئی تھیں۔ مگر وہ کسی نہ کسی طرح اپنا ہر کام کر ڈالتی تھیں۔

والدہ کے اندر خود غرضی اور مادہ پرستی بالکل نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ دوسروں کی خدمت کرنے کے لیے تیار رہتی تھیں۔ ان کا ایک محبوب طریقہ یہ تھا کہ غریب اور یتیم لڑکوں اور لڑکیوں کو اپنے یہاں رکھ کر پرورش کرتیں اور اگر ممکن ہوتا تو ان کی شادی بھی کرا دیتیں۔ پڑوس کے ایک شخص جو ان کے یہاں

بطور باورچی کام کرتے تھے ، ان کو انھوں نے اپنے گھر کے وسیع صحن کا بڑا حصہ صرف اس لیے دے دیا کہ وہ اپنے گھر کی توسیع کرسکیں ۔

والدہ کے میکے کے لوگ بڑے زمیندار تھے ۔ وہاں کی زمینداری میں ان کا تقریباً ۲۰ بیگھہ (پختہ) حصہ ہوتا تھا ۔ مگر والدہ نے بطور خود اپنا حصہ چھوڑ دیا اور دست برداری کے کاغذ پر اپنی رضامندی سے دستخط کر دیئے ۔ وغیرہ وغیرہ

والدہ کی زبان پر سب سے زیادہ جو جملہ رہتا تھا وہ یہ تھا کہ " اللہ آخرت میں ٹھکانا دے " وہ اکثر گہرے تاثر کے ساتھ اس دعائیہ جملہ کو دہراتی رہتی تھیں ۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کی یہ پکار سن لی اور ان کی نیک نفسی کی بنا پر انھیں آخرت میں اچھا ٹھکانا دیدیا ۔ ان کے تمام آخری رسوم نہایت بہتر طور پر انجام پائے ۔ ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ ان دنوں بارش کا زمانہ تھا ۔ روزانہ بارش کا سلسلہ جاری رہتا تھا ۔ مگر ۸ اکتوبر کو بارش رُکی رہی ۔ حالاں کہ ۸ اکتوبر سے پہلے بھی بارش جاری تھی اور ۸ اکتوبر کے بعد بھی بارش جاری رہی ۔ مجھے بعد کو معلوم ہوا کہ والدہ کے انتقال کی خبر سننے کے بعد تبلیغی مرکز (نظام الدین نئی دہلی) میں ان کے لیے اجتماعی دعا کی گئی ۔ اسی طرح اور بعض مساجد اور مدارس میں ان کے لیے خصوصی دعائیں کی گئیں ۔

یہاں ایک خواب قابل ذکر ہے جو میری ڈائری میں ۲۸ مارچ ۱۹۷۷ کی تاریخ کے ساتھ درج ہے ۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ والدہ اس دنیا سے رخصت ہو کر آسمان کی طرف لے جائی جا رہی ہیں ۔ وہ اوپر پہونچی ہیں تو ایک مقام آیا جہاں ایک سرنگ نما بالکل اندھیرا راستہ تھا ۔ اس وقت والدہ کے بارہ میں اوپر سے آواز آئی کہ :

ان کو دوسری طرف دروازۂ نور پر لے جاؤ ۔ ان کو وہاں سے داخلہ ملے گا

یہ خواب جو میں نے ۱۹۷۷ میں دیکھا تھا وہ گویا میرے لیے ایک پیشگی بشارت تھی کہ تمہاری والدہ کو موت کے بعد والی دنیا میں نورانی گھر میں جگہ ملنے والی ہے ۔ خدایا تو میری والدہ پر اپنے نور کی بارش فرما ، ان کو جنت کے اعلیٰ مقامات میں جگہ دے ، اور ہم سب کو اپنی رحمتِ خاص سے بخش دے ۔

ایک تجربہ

میری والدہ (زیب النساء) کا انتقال ۸ اکتوبر ۱۹۸۵ کو ہوا۔ ان کے انتقال پر دو ہفتے گزر چکے تھے ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۵ کی رات کو ساڑھے دس بجے میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا کچھ پڑھ رہا تھا۔ اچانک پاس کے کمرے سے والدہ کی آواز آنے لگی۔ آواز ہو بہو والدہ مرحومہ کی تھی۔ میں حیران ہو کر اٹھا اور کمرہ میں گیا تو معلوم ہوا کہ وہاں والدہ مرحومہ کا ٹیپ بجایا جا رہا ہے۔ میرے بچوں نے ایک سال پہلے والدہ مرحومہ کی ۴۵ منٹ کی ایک گفتگو ٹیپ ریکارڈر پر ریکارڈ کر لی تھی۔ اس میں والدہ میرے بچوں کے ساتھ بات کرتی ہوئی اور ہنستی بولتی ہوئی سنائی دے رہی ہیں۔

میں بچوں کے ساتھ بیٹھ کر والدہ کا ٹیپ سننے لگا۔ میں سنتا جا رہا تھا اور میرے اوپر عجیب حالت طاری ہو رہی تھی۔ جس شخصیت کو میں ۸ اکتوبر کو خود اپنے ہاتھ سے قبر میں دفن کر چکا تھا، عین اسی شخصیت کی آواز ۲۵ اکتوبر کو بجنسہ اسی شکل میں سُن رہا تھا۔ وہی لہجہ، وہی زبان، وہی انداز، غرض سب کچھ اس قدر مطابق اصل تھا جیسے کہ مرحومہ کمرہ میں بیٹھی ہوئی ہیں اور میں پہلے کی طرح ان کی اپنی آواز کو سُن رہا ہوں جیسا کہ ان کی زندگی میں سنتا تھا۔

اس تجربہ نے ایک آیت کا مطلب میرے ذہن پر کھول دیا۔ سورہ الذاریات میں ان لوگوں کا جواب دیا گیا ہے جو بعث بعد الموت کے بارہ میں شبہ ظاہر کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں فرمایا گیا ہے کہ بے شک وہ یقینی ہے، اسی طرح جس طرح تم بولتے ہو۔ یہاں آیت کے الفاظ یہ ہیں:

وَفِی السَّمَاءِ رِزْقُکُمْ وَمَا تُوعَدُونَ۔ فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَا اَنَّکُمْ تَنْطِقُونَ (الذاریات ۲۲-۲۳)

اور آسمان میں تمہاری روزی ہے اور وہ بھی جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ پس آسمان اور زمین کے رب کی قسم، بے شک وہ برحق ہے اسی طرح جیسے کہ تم بولتے ہو۔

اس آیت کی تفسیر میں عام طور پر مفسرین بس اتنا کہہ کر گزر جاتے ہیں کہ وہ تمہارے نطق کی طرح برحق اور یقینی ہے (ای حق مثل نطقکم، تفسیر النسفی) میں نے اکثر تفسیروں میں اس آیت کا مطلب تلاش کیا مگر اس کی تشریح میں اس سے زیادہ اور کچھ نہ مل سکا۔ مگر ۲۵ اکتوبر کی رات کو والدہ مرحومہ

کا ٹیپ سننا میرے لیے اس آیت کی تفسیر بن گیا۔ سچ ہے کہ قرآن کے عجائب اور معانی کبھی ختم نہ ہوں گے (لاتنقضی عجائبہ)

والدہ مرحومہ کا ٹیپ نطق کی شکل میں گویا ان کی زندگی کا اعادہ تھا۔ اس کو سنتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں زندگی بعد موت کے امکان کا عملی تجربہ کر رہا ہوں۔ جیسے ایک شخصیت کے وفات پانے کے بعد میرے سامنے اس کو دہرایا جا رہا ہو۔ جیسے ایک زندگی پر موت واقع ہونے کے بعد اس کے منہ سے نکلی ہوئی بات کو Replay کیا جا رہا ہو۔

نطق (بولنا) انسانی شخصیت کا سب سے زیادہ نمائندہ وصف ہے۔ اسی لیے انسان کو حیوان ناطق کہا جاتا ہے۔ انسان کی موت کے بعد اس کے نطق کا اس طرح کامل طور پر محفوظ رہنا اور اس کا نہایت صحیح اعادہ ممکن ہونا بتاتا ہے کہ موت کے بعد بھی زندگی باقی رہتی ہے یا کم از کم اس کو دہرایا جا سکتا ہے میری والدہ مرحوم ہو چکی تھیں مگر وہ اپنی آواز کے روپ میں بدستور پوری طرح زندہ تھیں۔

جب میں والدہ مرحومہ کی ٹیپ کی ہوئی آواز سن رہا تھا تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے مرحومہ دوبارہ اٹھ کر پہلے کی طرح بولنے لگی ہوں۔ اگر میں آنکھ بند کر کے سنوں تو مجھے کچھ بھی فرق معلوم نہ ہوگا۔ میرے لیے یہ ٹیپ بعث بعد الموت کا ایک مشینی نمونہ بن گیا ——— یہ واقعہ جو آج مشینی طور پر ہو رہا ہے۔ یہی کل حقیقی طور پر ہوگا۔ آواز کا یہ واقعہ آخرت کے واقعہ کا ابتدائی مظاہرہ ہے۔ انسانی ٹیپ خدائی ٹیپ کی پیشگی اطلاع ہے۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں بتایا گیا ہے کہ آسمان میں تمہارا رزق بھی ہے اور تمہاری وہ حیاتِ ثانی بھی جس کی تم کو خبر دی جا رہی ہے۔ ٹیپ ریکارڈر کی ایجاد کے بعد یہ بات محض خبر نہیں رہی بلکہ ایک معلوم واقعہ بن چکی ہے۔ انسانی ساخت کا ٹیپ ریکارڈر چھوٹی سطح پر اسی حقیقت کا مظاہرہ کر رہا ہے جو زیادہ بڑی سطح پر کائنات میں موجود ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ خدا کی کائنات ایک عظیم ریکارڈر ہے۔ انسان کی بنائی ہوئی مشین کسی انسان کے صرف جزئی پہلو کو ریکارڈ کر پاتی ہے۔ کائناتی ریکارڈر انسان کی پوری زندگی کو انتہائی کامل شکل میں ریکارڈ کر رہا ہے۔ اور جب قیامت برپا ہوگی تو کائنات خدا کے حکم سے ہر انسان کا اسی طرح اعادہ کر دے گی جس طرح آج ٹیپ ریکارڈر انسان کی آواز کا اعادہ کر رہا ہے۔

مسلم پریس

مسلم دنیا میں پریس کا دور انیسویں صدی میں مغربی فاتحین کے ذریعہ آیا۔ مسلمانوں کو ایک طرف غیر مسلم اقوام سے مغلوبیت کا تجربہ ہو رہا تھا۔ دوسری طرف عین اسی زمانہ میں وہ پریس کے دور میں بھی داخل ہو رہے تھے۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم پریس اپنے آغاز ہی میں احتجاجی پریس بن کر رہ گیا۔ پریس کا کام صرف یہ رہ گیا کہ وہ اس رد عمل کی ترجمانی کرتا رہے جو مسلمانوں کے اندر سیاسی اور تہذیبی شکست کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔

بیسویں صدی کے آخر میں پہونچ کر بھی مسلم پریس کا یہ احتجاجی مزاج پوری شدت کے ساتھ باقی ہے۔ آج مسلم دنیا میں جتنے بھی اخبار یا رسالے نکلتے ہیں ان سب کا ایک مشترک نام رکھنا ہو تو یقیناً وہ احتجاج (Protest) ہوگا۔

مزید یہ کہ یہ احتجاج بھی عملاً صرف جھوٹے الفاظ کی بے اثر نمائش بن کر رہ گیا ہے۔ احتجاج کی قیمت اس وقت ہے جب کہ وہ واقعات کے درست جائزہ پر مبنی ہو۔ مگر مسلم صحافت کا حال سراسر اس کے خلاف ہے۔ آج تقریباً ہر مسلم پرچے میں دنیا کے مسلمانوں کے احوال پر تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ مگر یہ تبصرے ہمیشہ یک طرفہ، مبالغہ آمیز اور حقائق سے زیادہ لفاظی پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس معاملہ میں غالباً کسی بھی مسلم اخبار یا رسالہ کا کوئی استثناء نہیں۔

یہ بات مسلم صحافت میں اتنی زیادہ عام ہے کہ کسی بھی ملکی یا غیر ملکی زبان کے پرچے سے اس کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ یہاں ہم اپنی بات کی وضاحت کے لیے صرف ایک مثال نقل کرتے ہیں۔

ترجمان القرآن (لاہور) مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کا قائم کردہ ماہنامہ ہے جو نصف صدی سے بھی زیادہ عرصہ سے نکل رہا ہے۔ اس کی اشاعت (ستمبر ۱۹۸۵) کے ۲۰ صفحات کے اداریہ میں دنیا بھر کے مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لیا گیا ہے اس اداریہ کا آغاز اس جملہ سے ہوتا ہے ——— "اس مرتبہ ہم احوال عالم پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ

یہ اندازہ ہو سکے کہ اسلام اور مسلمانوں کو کیا درپیش ہے " (صفحہ ۲)

اس مفصل اداریہ میں ہندستان کے مسلمانوں کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے ۔ اس سلسلہ میں اداریہ کا ایک جز حسب ذیل ہے :

(بھارت میں) پچھلے دنوں بڑا خوفناک واقعہ یہ ہوا کہ قرآن کو خلاف قانون قرار دلوانے کے لیے عدالت عالیہ میں استغاثہ لے جایا گیا۔ عدالت نے بھی کوئی باقاعدہ فیصلہ دینے کے بجائے معاملہ کو گول مول چھوڑ کر استغاثہ کو اپنے ریمارکس کے ساتھ محض روک دیا۔ گویا شرارت کا دروازہ اب بھی بند نہیں ہے ۔ اس استغاثہ کے سلسلہ میں کم سے کم بنگلہ دیش میں بڑا ابھاری مظاہرہ ہوا۔ البتہ پاکستان خاموش رہا۔ (صفحہ ۸)

" ترجمان القرآن " مسلم دنیا کا ایک مشہور اور ذمہ دار ماہنامہ ہے ۔ مگر اس نے اپنے اداریہ میں ہندستانی مسلمانوں کے مذکورہ مسئلہ کے بارے میں جو الفاظ لکھے ہیں وہ سراسر خلاف واقعہ ہیں ۔ یہ ماہنامہ اپنے آپ کو جس قرآن کا ترجمان بتاتا ہے اس میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب تم کو کوئی خبر ملے تو اس کی مکمل تحقیق کرو (اذا جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا) اور یہ کہ درست بات کہو (قولوا قولاً سدیدا) مگر حال یہ ہے کہ جس مقدمہ کو ہندستانی ہائی کورٹ نے قطعی خارج کر دیا اس کی بابت یہ الفاظ لکھے گیے ہیں کہ عدالت نے اس کو گول مول چھوڑ دیا۔

مذکورہ قرآنی حکم کا تقاضا تھا کہ یہ ماہنامہ اس معاملہ پر رائے زنی کرنے سے پہلے اس کی پوری تحقیق کرتا اور چوں کہ یہ معاملہ ایک عدالتی معاملہ تھا اس لیے اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس عدالتی فیصلہ کو حاصل کر کے پڑھے جس کی روشنی میں وہ اپنی رائے دے رہا ہے ۔ مگر ماہنامہ کے مذکورہ الفاظ تقریباً یقینی طور پر بتاتے ہیں کہ وہ عدالت کے فیصلہ کو پڑھے بغیر لکھے گیے ہیں راقم الحروف کی یہی رائے عام مسلم تبصرہ نگاروں کے بارے میں ہے ۔ تقریباً ہر قابل ذکر مسلمان نے اس معاملہ میں رائے زنی کی ہے ۔ مگر میری معلومات کے مطابق شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جس نے مذکورہ قرآنی احکام پر باقاعدہ عمل کیا ہو ۔

راقم الحروف کو جب اخبارات سے کلکتہ ہائی کورٹ کے مذکورہ فیصلہ کا علم ہوا تو اس

نے سب سے پہلے یہ کوشش کی کہ وہ اس عدالتی فیصلہ کو حاصل کرے۔ میں نے اپنے کلکتہ کے ایک رفیق جناب قاری محمد اسماعیل ظفر ایم اے کو خط لکھا کہ وہ عدالت سے اس کی مکمل نقل حاصل کرکے روانہ کریں۔ انھوں نے فوراً اس کی کوشش شروع کردی۔ یہاں تک کہ انھوں نے فیصلہ کی مکمل نقل حاصل کرکے مجھے روانہ کی جو ۱۴ اگست ۱۹۸۵ کو مجھے دہلی میں مل گئی۔

جسٹس بمل چندر باسک (کلکتہ ہائی کورٹ) نے اپنا یہ فیصلہ ۱۷ مئی ۱۹۸۵ کو دیا ہے اور وہ ۱۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس فیصلہ کے ۴۱ پیراگراف ہیں۔ جسٹس باسک تفصیلی جائزہ کے بعد اپنے فیصلہ کے پیراگراف نمبر ۳۹ میں کہتے ہیں کہ مذکورہ اسباب کے تحت یہ بات واضح ہے کہ اس عدالت کے حدود اختیار سے باہر ہے کہ وہ قرآن پر پابندی لگانے کا حکم جاری کرے جس کی کہ درخواست میں اپیل کی گئی ہے۔

اس کے بعد پیراگراف نمبر ۴۰ میں واضح طور پر یہ الفاظ ہیں کہ مذکورہ اسباب کی بنا پر یہ درخواست ڈسمس کی جاتی ہے:

For the aforesaid reasons this application stands dismissed.

کیسی عجیب بات ہے کہ ایک مقدمہ جس کو ہندستان کی عدالت نے خارج کر دیا، اس کی بابت بالکل غلط طور پر یہ الفاظ لکھے گیے ہیں کہ عدالت نے باقاعدہ فیصلہ دیے بغیر اس کو گول مول حالت میں چھوڑ دیا اور اس طرح شرارت کا دروازہ کھلا رکھا۔ نیز اس سلسلہ میں بنگلہ دیش میں ہونے والے جھوٹے مظاہرہ کا حوالہ اس طرح دیا گیا ہے گویا کہ وہ کوئی قابل فخر اسلامی کارنامہ ہو۔

میرا ذاتی تجربہ ہے کہ اس قسم کے واقعات کی رپورٹنگ غیر مسلم پریس میں اس سے زیادہ صحیح ہوتی ہے جو نام نہاد مسلم پریس میں نظر آتی ہے۔ مسلم پریس کی تقریباً تمام رپورٹیں اسی طرح بے اصل ہوتی ہیں جس کا ایک نمونہ اوپر کی مثال میں نظر آتا ہے۔ یعنی واقعات کی صحیح تصویر دیے بغیر یک طرفہ طور پر فریق ثانی کو برا بتانا۔ اس قسم کا جھوٹا احتجاج نہ خدا کے نزدیک کوئی قیمت رکھتا ہے اور نہ خلق کے نزدیک۔ مسلمان اگر ایک ہزار سال تک اس قسم کا احتجاج کرتے رہیں تب بھی اس کا کوئی فائدہ انھیں ملنے والا نہیں۔

دین کی نصرت کرنے والے

عن ابی الولید عبادة بن الصامت رضی الله عنه قال : بايعنا رسول الله صلی الله عليه وسلم على السمع والطاعة فی العسر واليسر والمنشط والمكره وعلى اثرة علينا وعلى ان لا ننازع الامر اهله الا ان تروا كفرا بواحا عندكم من الله فيه برهان وعلى ان نقول بالحق اينما كنا لا نخاف فی الله لومة لائم ۔ (متفق عليه)

حضرت عبادہ بن صامت انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی اس پر کہ ہم سنیں گے اور مانیں گے تنگی میں بھی اور آسانی میں بھی ۔ پسند میں بھی اور ناپسند میں بھی۔ اور اس پر کہ ہمارے اوپر (دوسروں کو) ترجیح دی جائے ۔ اور اس پر کہ ہم صاحب حکم سے حکم میں نزاع نہ کریں گے الا یہ کہ تم کھلم کھلا کفر دیکھو جس کے لیے تمہارے پاس خدا کی طرف سے برہان ہو ۔ اور یہ کہ ہم حق کے ساتھ بولیں گے خواہ ہم جہاں ہوں ۔ ہم اللہ کے معاملہ میں ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے ۔

"بیعت" کے لفظی معنی بیچنے کے ہیں ۔ اس سے مراد وہ عہد ہے جو ایک فرد اجتماعی ذمہ دار کے ساتھ اجتماعیت پر قائم رہنے کے لیے کرتا ہے ۔ عہدِ اجتماعیت کو بیعت سے تعبیر کرنا اس کی شدت کو بتا رہا ہے ۔ گویا بیعت سے وابستہ ہونے کے بعد فرد اپنی ذات کو اجتماعیت کے ہاتھ بیچ دیتا ہے ۔ اس کے بعد اس کی ذات اپنی نہیں رہتی بلکہ اجتماعی ادارہ کی ہو جاتی ہے ۔

مذکورہ بیعت مدینہ کے مسلمانوں سے لی گئی جن کو انصار کہا جاتا ہے ۔ یعنی خدا کے دین کی مدد کرنے والے ۔ اس وقت اسلام کا قافلہ بالکل لٹی ہوئی حالت میں تھا ۔ ایسے نازک وقت میں مدینہ کے اہلِ ایمان نے اس کی غیر مشروط مدد کرنے کا عہد کیا اور پھر ساری زندگی اس پر قائم رہے ۔ انھوں نے نصرتِ دین کو اس کے آخری تقاضوں کی حد تک انجام دیا اسی لیے وہ خصوصی طور پر "انصار" کہے گئے ۔

مدینہ کے مسلمانوں سے جن الفاظ میں نصرت دین کی بیعت لی گئی اس پر غور کیجیے ۔ اس میں تمام وہ باتیں ہیں جن کی وجہ سے لوگ "بیعت" توڑ دیتے ہیں، جن کو عذر بنا کر وہ اجتماعیت سے الگ ہو جاتے ہیں

ایسی چیزوں پر سمع وطاعت کی پابندی کا اقرار کرانے کا مطلب یہ ہو اکہ ——— ساتھ نہ دینے والے حالات میں بھی ساتھ دو۔ وہ مواقع جن کے پیش آنے پر عام آدمی بدک جاتا ہے ان کے پیش آنے کے بعد بھی دینی قافلہ سے جڑے رہو۔ جن شکایتوں کو عذر بنا کر لوگ الگ ہو جاتے ہیں ان شکایتوں کے باوجود اتحاد وتعاون کو نہ چھوڑو۔

وہ لوگ جن کا حال یہ ہو کہ آسانی میں ساتھ دیں اور مشکل کے وقت ساتھ نہ دیں۔ وہ اس وقت تک ٹھیک رہیں جب تک معاملہ ان کی پسند کے مطابق ہو اور جب معاملہ ان کی پسند کے خلاف ہو تو بگڑ کر الگ ہو جائیں۔ جو ہمیشہ اپنے آپ کو اگلی نشست پر دیکھنا چاہیں اور پچھلی نشست پر بیٹھنا انھیں گوارا نہ ہو۔ جو عہدوں کی ایسی تقسیم کو قبول نہ کریں جس میں خود ان کی ذات کو اعلیٰ عہدہ نہ دیا گیا ہو۔ ایسے لوگ کبھی دین کی نصرت کی توفیق نہیں پاتے۔ ایسے لوگ صرف اپنی تاریخ بناتے ہیں۔ دین کی تاریخ بنانا ان کے لیے مقدر نہیں۔

ایسا ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے خیال کے مطابق ناانصافی محسوس کرے۔ وہ ایک چیز کو دیکھے اور بطور خود یہ سمجھے کہ یہ حق کے خلاف ہو رہا ہے۔ ایسے مواقع پر وہ اظہار خیال کر سکتا ہے۔ وہ سنجیدہ انداز میں ناانصافی کو بیان کر سکتا ہے۔ مگر ناانصافی کے نام پر اجتماعیت سے کٹنا کسی کے لیے جائز نہیں۔ فرد کو صرف "قول" کا حق ہے، اس سے آگے اسے کوئی حق حاصل نہیں۔

بیعت میں مزید یہ کہلایا گیا ہے کہ قافلۂ اسلام کے امیر کی اطاعت سے تم صرف اس وقت نکل سکتے ہو جب کہ تم اس کے اندر علانیہ کفر کا مشاہدہ کرو۔ اب اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ ایسے کفر کا واقعہ شاذ ہی کبھی پیش آتا ہے تو الشاذ کالمعدوم کے اصول پر اس کا مطلب عملاً یہ قرار پاتا ہے کہ تم کبھی بھی امیر کی اطاعت سے نہ نکلو۔ تم کسی حال میں بھی اس کی نافرمانی نہ کرو۔

اجتماعی زندگی فرد کی موت پر قائم ہوتی ہے۔ بہت سے افراد جب یہ عہد کرتے ہیں کہ وہ اجتماعیت کی خاطر اپنی رائے کو قربان کریں گے۔ وہ اپنے آپ کو حذف کر کے اجتماعیت کا ساتھ دیں گے، اسی وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ کوئی حقیقی اجتماعیت وجود میں آئے۔

ایسے ہی لوگ اسلام کو زندہ کرتے ہیں۔ جن کے اندر یہ صفات نہ ہوں وہ صرف اسلام کو برباد کریں گے، وہ اس کے زندہ کرنے والے نہیں بن سکتے۔

خدا کی مدد

عالم اسلام پر مغرب کے حملہ کا آغاز سولھویں صدی عیسوی میں ہوتا ہے جب کہ پرتگالیوں نے یورپ اور ہندستان کے درمیان سمندری راستہ دریافت کرکے بحر عرب پر قبضہ کرلیا اور عربوں کی تجارت اس علاقہ سے کاٹ دی۔ سترہویں صدی میں اسٹیم انجن کی دریافت اور اٹھارویں صدی میں جدید ٹکنالوجی کا وجود میں آنا یورپ کے لیے طاقت وقوت کا نیا میدان کھل جانے کے ہم معنیٰ تھا۔ اس کے بعد ۱۸۶۹ میں جب نہر سوئز بنی اور اس نے بحر روم اور بحر احمر کے درمیان سیدھا سمندری راستہ کھول دیا تو عالم اسلام پر مغرب کے غلبہ کا عمل اپنی آخری انتہا کو پہونچ گیا۔ انیسویں صدی کے آخر تک ایشیا اور افریقہ کا کوئی مسلم ملک نہ تھا جو بالواسطہ یا براہِ راست طور پر مغربی استعمار کے قبضہ میں نہ آچکا ہو۔

مادی قوت کے اعتبار سے مسلم اقوام اور مغربی اقوام کا فرق صرف مقداری نہ تھا بلکہ نوعی تھا۔ یعنی عالم اسلام اگر" دستی ہتھیاروں "سے مسلح تھا تو عالم مغرب" دور مار ہتھیاروں "سے۔ ایسی حالت میں لوگوں کا یہ تاثر بظاہر بیجا نہ تھا کہ مغرب کا غلبہ اب ختم ہونے والا نہیں۔ مگر قدرت کا فیصلہ ظاہر ہوا۔ دوسری جنگ عظیم (۴۱ - ۱۹۳۹) میں مغربی طاقتیں خود آپس میں لڑ گئیں۔ تاریخ انسانی کی اس سب سے زیادہ بھیانک جنگ نے ان کو اتنا کمزور کر دیا کہ ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ ایشیا اور افریقہ کے مقبوضات سے واپس چلی جائیں۔

تاہم ایک شدید تر محاذ ابھی باقی تھا۔ یہ مغرب کی صنعتی برتری تھی۔ مسلم اقوام اپنے محدود وسائل اور ناکافی ٹکنکل صلاحیت کے ساتھ اس میدان میں آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مگر ایلون ٹافلر کے الفاظ (۱۹۷۰) میں سوال یہ تھا کہ مسلم قومیں جب بہزار دقت اپنے آپ کو انڈسٹریل ایج میں پہونچانے میں کامیاب ہوں گی، اس وقت مغرب سُپر انڈسٹریل ایج میں پہونچ چکا ہوگا۔ عین اس وقت " پٹرو ڈالر " ایک خدائی کرشمہ بن کر ظاہر ہوا اور اس نے نہ صرف مسلم اقوام کی صنعتی پسماندگی کی تلافی کر دی بلکہ بہت سے پہلوؤں سے ان کو جدید اقتصادی دنیا میں برتری عطا کر دی۔

حقیقت یہ ہے کہ امت مسلمہ کتاب محفوظ کی حامل ہے۔ اس کے طفیل میں اللہ تعالیٰ نے اس کی دنیوی حفاظت کی ذمہ داری لے لی ہے۔ اسی خدائی حفاظت نے تاتاری حملے اور صلیبی لڑائیوں کے وقت مسلمانوں

کو محفوظ رکھا۔ اور اسی نے موجودہ زمانہ میں ان کو جدید طاقتوں کا شکار ہونے سے بچایا ہے۔

تاہم حفاظت کا یہ معاملہ صرف دنیوی پہلو سے ہے۔ آخرت کی نجات کے لیے اللہ تعالیٰ نے کسی سے اس قسم کا کوئی وعدہ نہیں کیا ہے۔ آخرت کی نجات کا تمام تر انحصار، ذاتی اصلاح کے بعد، اس پر ہے کہ ہم خدا کی امانت کو اس کے دوسرے بندوں تک پہونچاتے ہیں یا نہیں۔ رسول نے جس طرح اپنے زمانہ کے لوگوں پر خدا کے دین کی گواہی دی، ٹھیک اسی طرح ہر دور کے مسلمانوں کو اپنے زمانہ کے لوگوں کے سامنے اس کا گواہ بن کر کھڑا ہونا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو صرف ذاتی اصلاح بھی ان کو خدا کے یہاں بازپرس سے نہیں بچا سکتی۔

ختم نبوت کے بعد امت مسلمہ نبوت کی قائم مقام ہے۔ اس کی کامیابی یا ناکامی اسی کارِ شہادت کی ادائیگی پر موقوف ہے جس پر نبی کا معاملہ موقوف ہوتا تھا۔ نبی اگر خدائی پیغام رسانی کے کام کو انجام نہ دے تو خدا کی نظر میں اس کی حیثیتِ رسالت ہی متحقق نہیں ہوتی تھی (مائدہ۔ ۶۷) اسی طرح ہم اگر اپنے زمانہ کی قوموں پر دین کی گواہی دینے کا فریضہ ادا نہ کریں تو اندیشہ ہے کہ ہمارا امت محمدی ہونا ہی مشتبہ نہ ہو جائے اور آخرت میں ہم ناکام و نامراد قرار پائیں۔ اگر تمام مسلم قومیں اس کام کے لیے نہیں اٹھتیں تو کم سے کم کسی ایک قوم یا کسی ایک جماعت کا دعوت الی اللہ کے اس کام کے لیے اٹھنا ضروری ہے۔

قدیم زمانہ میں جب کہ سیاست کی بنیاد مذہب پر ہوتی تھی۔ ایک بے ضرر دعوتی تحریک کو بھی حکمراں طبقہ اپنے خلاف ایک خطرہ سمجھنے لگتا تھا۔ اور بہت جلد اس کو مٹانے کے لیے کھڑا ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانہ میں اس مقصد کے لیے اٹھنے والے لوگ آروں سے چیرے گئے۔ اور آگ میں جلائے گئے۔ مگر موجودہ زمانہ میں مذہب اور سیاست کی علاحدگی نے ہم کو دعوتی کام کا انتہائی قیمتی موقع فراہم کر دیا ہے اگر ہم مناظرہ بازی سے بچیں اور سیاسیات میں الجھنے کی غلطی نہ کریں تو آزادی فکر اور سائنسی طریق مطالعہ کے اس زمانہ میں ہر قسم کے خطرہ سے محفوظ رہ کر ساری دنیا میں اسلام کی اشاعت کا کام جاری رکھ سکتے ہیں۔

مزید یہ کہ جدید افکار نے اسلام کو لوگوں کے لیے قابل فہم بنانے کے بہت سے نئے امکانات کھول دیئے ہیں جو اس سے پہلے کبھی موجود نہ تھے۔ ان امکانات کو استعمال کیا جائے تو اسلام کو معجزاتی استدلال کے ساتھ جدید دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے۔

Ancient holy book 1300 years ahead of its time

TORONTO (CP) — The 1,300-year-old Koran contains passages so accurate about embryonic development that Moslems can reasonably believe them to be revelations from God, a Canadian embryologist says.

The Statement by Dr. Keith Moore of University of Toronto, corroborated by test-tube baby pioneer. Dr. Robert Edwards, comes after the pair spent two years studying the phenomenon at the request of Islamic scholars at King Abdul Aziz University in Jeddah, near Mecca.

"I am amazed at the scientific accuracy of these statements which were made in the seventh century," Moore said.

Moslems believe the Koran was revealed to the Prophet Mohammed by God, after which he propounded Islam, a religion that has the second-largest following in the world after Christianity.

Moore said the Koran verses describe semen "gushing" from the male upon ejaculation but fertilizing sperm being derived from only a small portion of the semen.

Moore writes: "It was not until the 18th century that Spallanzani showed experimentally that both male and female sex products were necessary for the initiation of development...

Another verse read: "God makes you in the wombs of your mother in stages, one after another, within three veils of darkness."

Moore said the three veils could reasonably be interpreted to mean the mother's abdominal wall, the wall of the uterus and the amniochorionic membrane.

Another verse read: "Thereafter, we created of the drop a thing which clings, a leech-like structure."

Moore and the others found the Arab leech bears a striking resemblance to the embryo at 42 days, and the embryo does cling to the wall of the uterus at this stage.

Among Mohammed's collected sayings, Moore found one that says 42 days after conception, God sends an angel to give the embryo human features such as eyes and ears.

Embryonic research shows that at 42 days eyes and ears are clearly visible.

The Citizen, Ottawa (Canada), November 22, 1984

Kor'an scores over Modern Science

A University of Toronto embryologist has made several trips to Saudi Arabia to help explain some of the verses from the Koran relating to human embryo development. Dr. Keith Moore's findings, corroborated by test-tube baby pioneer, Dr. Robert Edwards, reveal the verses contain an accurate description of the stage by stage development of the human embryo, something which was proposed by western experts only in 1940 and most of which has been proved only in the past decade and a half.

The Times of India (New Delhi), December 10, 1984

قرآن اور سائنس

۱۹۸۴ کے آخر میں ایک خبر مختلف اخبارات میں آئی تھی۔ کناڈا کے اخبار سٹی زن (۲۲ نومبر ۱۹۸۴) نے اس کی سرخی ان الفاظ میں لگائی:

قدیم مقدس کتاب اپنے وقت سے ۱۳ سو سال آگے

نئی دہلی کے اخبار ٹائمس آف انڈیا (۱۰ دسمبر ۱۹۸۴) میں یہ خبر حسب ذیل سرخی کے ساتھ چھپی:

قرآن جدید سائنس پر بازی لے جاتا ہے

جنینیات کے ایک عالم جن کا تعلق کناڈا کی ٹورانٹو یونیورسٹی سے ہے، انھوں نے سعودی عرب کے کئی سفر کیے ہیں تاکہ قرآن کی کچھ آیتوں کی تشریح کرنے میں مدد کریں۔ یہ آیتیں وہ ہیں جن میں انسانی جنین کے ارتقار کا ذکر ہے۔

یہ ڈاکٹر کیتھ مور ہیں۔ ان کی تحقیقات جو ٹسٹ ٹیوب بے بی کے موجد ڈاکٹر رابرٹ ایڈورڈس سے مطابقت رکھتی ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کی متعلقہ آیتیں انسانی جنین کے درجہ بدرجہ ارتقار کا نہایت صحیح بیان ہیں۔ یہ چیز وہ ہے جس کا ذکر مغربی ماہرین نے پہلی بار ۱۹۴۰ میں کیا تھا۔ اور اس سلسلہ کی اکثر تفصیلات صرف پچھلے پندرہ برسوں میں علمی طور پر ثابت کی جا سکی ہیں۔ ڈاکٹر مور نے لکھا ہے کہ ۱۳ سو سالہ قدیم قرآن میں جنینی ارتقار کے بارے میں اس قدر درست بیانات موجود ہیں کہ مسلمان معقول طور پر یقین کر سکتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے اتاری ہوئی کتاب ہے۔

یہ دو برس پہلے کی بات ہے، ٹورانٹو یونیورسٹی کے ایک ماہر جنینیات ایک غیر معمولی سائنسی مشن پر سعودی عرب گیے۔ ان سے قرآن کی چند آیات کی تشریح میں مدد چاہی گئی تھی۔ یہ ڈاکٹر کیتھ مور تھے۔ اولین ٹسٹ ٹیوب بچے کی پیدائش کے محقق ڈاکٹر ایڈورڈ نے بھی ان کی توضیحات کی تصدیق کر دی تھی۔ ان دونوں سائنس دانوں نے مسلم علمار کو آیات قرآنی کے بارے میں اپنی دریافت سے حیران کر دیا تھا۔ وہی قرآن جس کو مسلمان تیرہ سو برس سے حفظ اور تلاوت کرتے چلے آرہے ہیں۔

جو انھوں نے دریافت کیا تھا وہ یہ تھا کہ قرآن میں انسانی جنین کا جو نظریہ بیان کیا گیا ہے وہ اب ایک ناقابل تردید صداقت بن کر سامنے آیا ہے اور یہ کہ مغربی محققین پر اس حقیقت کا انکشاف ۱۹۴۰ میں ہوا

اس ضمن میں زیادہ تر معلومات تو محض گذشتہ پندرہ برس میں سامنے آئی ہیں۔ ڈاکٹر کیتھ مور ٹورانٹو یورسٹی کے شعبہ تشریح الاعضاء کے چیرمین ہیں۔ تخلیق انسانی سے بحث کرنے والی آیات قرآنی پر اپنا خصوصی مقالہ پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

" مجھے اس بات نے حیرت میں ڈال دیا جب مجھے یہ پتہ چلا کہ قرآن نے ساتویں صدی عیسوی میں جو حقائق پیش کیے وہ کس قدر درست اور سائنسی صداقتوں کے حامل ہیں "

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قرآن ساتویں صدی عیسوی میں خدا کی طرف سے اپنے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے اسلام دنیا کے سامنے پیش کیا۔ آج اسلام عیسائیت کے بعد دوسرا بڑا مذہب ہے۔ یاد رہے کہ ڈاکٹر مور یونائیڈ چرچ کے ممبر اور ایک بڑے پادری کے بیٹے ہیں۔ وہ اپنے عقیدے پر مطمئن ہیں اور ایک ملاقات میں بتا چکے ہیں کہ اسلام قبول کرنے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں۔ ڈاکٹر مور کہتے ہیں کہ میں نے بائبل کے عہدنامہ قدیم اور جدید کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ لیکن قرآنی آیات سے ان کی کوئی مماثلت نظر نہیں آئی۔ جنینیات پر ان کی دو تصنیفات معیاری درسی کتب کا درجہ رکھتی ہیں۔ اور دنیا کی زبانوں میں ان کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر مور کہتے ہیں کہ جنین کے ابتدائی ۲۸ روز میں نمو کے متعلق قرآنی آیات نے جو حقائق بیان کیے ہیں وہ اتنے صحیح ہیں کہ انسانی عقل کو تعجب میں ڈال دیتے ہیں۔ ڈاکٹر مور کو یقین ہے کہ:

" قرآن کی آیات اور پیغمبر اسلام کے کچھ فرامین مذہب اور سائنس کے درمیان مدتوں سے حائل خلیج کو پاٹنے میں مدد کر سکتے ہیں "

جب ان سے پوچھا گیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ خام چیر پھاڑ کے نتیجے میں یہ معلومات سامنے آگئی ہوں تو انھوں نے کہا کہ اس مرحلے پر جنین کی جسامت ایک ملی میٹر کے دسویں حصے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ انسانی آنکھ کو ایک چھوٹے سے نقطے کی شکل میں نظر آتا ہے۔ اس کی شناخت ایک طاقتور خوردبین کے بغیر ممکن نہیں اور یہ بات اپنی جگہ تسلیم شدہ ہے کہ سترھویں صدی عیسوی سے پہلے خوردبین ایجاد نہیں ہوئی تھی۔

دو برس پہلے ڈاکٹر کیتھ مور کو جدہ کی شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی نے مدعو کیا تھا۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر لیارٹ ایڈورڈ راز کو بھی بلایا تھا۔ یہ وہی ڈاکٹر رابرٹ ہیں کہ جن کے کیمبرج یونیورسٹی میں کیے گئے تجربات کی بدولت پہلے ٹیسٹ ٹیوب بچے کی پیدائش عمل میں آئی۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر ٹی وی این پرشاد اور ڈاکٹر مارشل جانسن بھی مدعوئین میں شامل تھے۔ ڈاکٹر مور کہتے ہیں کہ اس موقع پر منعقدہ کانفرنس کے علماء نے ان

چاروں ماہرین کو قرآن کی متعدد آیات کے انگریزی میں تراجم پیش کیے اور ان سے رائے مانگی کہ آیا ان کی کوئی سائنسی تعبیر ہوسکتی ہے ؟ ایک آیت جو پیش کی گئی وہ یہ تھی :

" وہ تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں کے اندر تمہیں ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے ۔" (الزمر ۶)

ڈاکٹر مور کہتے ہیں کہ ان تین تاریکیوں کے بارے میں بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ان سے مراد پیٹ کی دیوار، رحم مادر کا پردہ اور بچے دانی کی اندرونی جھلی ہے ۔ ایک دوسری آیت میں بتایا گیا ہے کہ بعد میں بوند کو خون کے لوتھڑے (مضغہ) میں تبدیل کر دیا جاتا ہے ۔ عربی میں مضغہ کا لفظ جونک کے لیے آیا ہے ۔ ڈاکٹر مور اور دوسرے ماہرین کا خیال ہے کہ عرب میں پائی جانے والی جونک اور ۲۴ دن کے جنین میں حیرت انگیز طور پر مشابہت پائی جاتی ہے مزید یہ کہ اس مرحلے پر جنین رحم کی دیوار سے جونک کی طرح لپٹ جاتا ہے ۔

آگے کی ایک آیت کہتی ہے کہ یہ جونک نما مضغہ بعد میں چبائی ہوئی چیز کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔ اس مرحلے پر جنین کی شکل کی وضاحت کرنے کے لیے ڈاکٹر مور نے پلاسٹک کی ایک چھوٹی سی چیز تیار کی اور پھر اسے اپنے دانتوں سے چبایا اور پھر اسے بتایا کہ ۲۸ روز کے جنین کی شکل ہو بہو ایسی ہوتی ہے اور اس پر جو نشانات پائے جاتے ہیں وہ بھی دانتوں کے نشانوں کے مماثل ہوتے ہیں ۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلے پر جسم کے چند ہی اعضاء کی شناخت ہوسکتی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ صرف دل اور آنکھوں کے حصے کی پہچان ممکن ہوتی ہے ۔

ڈاکٹر مور نے کہا کہ آیات قرآنی کہتی ہیں کہ تیزی سے نکلنے والے مادہ منویہ کے ایک انتہائی مختصر حصے میں بار آور کرنے کی صلاحیت رکھنے والا عنصر پایا جاتا ہے ۔ ڈاکٹر مور نے اپنے مقالہ میں بتایا کہ جس حقیقت کی نشاندہی سپیلن زینی نے اٹھارھویں صدی عیسوی میں کی جب اس نے تجرباتی طریقے سے ثابت کیا کہ جب تک کہ نر اور مادہ کے جنسی تولیدی عناصر کی باہم آمیزش نہ ہو حیاتیاتی نمو نہیں ہوسکتی ۔ قرآن نے اس سے گیارہ صدیاں پہلے مخلوط قطرہ (نطفہ امشاج) کی نشاندہی کر دی اور بتایا کہ مرد اور عورت کے نطفوں کے باہمی ملاپ سے انسان کی تخلیق ہوتی ہے ۔ اسی طرح ماہرین کے ذیل میں یہ اشارہ موجود ہے کہ کس طرح ابتدائی حقیر بوند میں آدمی کا جامع نقشہ موجود ہوتا ہے ۔ یہ بوند مستقبل کے تمام کردار اور خصوصیات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہوتی ہے ۔

ایک امکان

اخرج ابو نعیم عن محمود بن لبید اخی بنی عبد الاشہل قال : لما قدم ابو الحیسم انس بن رافع مکۃ ومعہ فتیۃ من بنی عبد الاشہل فیہم ایاس بن معاذ رضی اللہ عنہ یلتمسون الحلف من قریش علی قومہم من الخزرج۔ فسمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہم فاتاہم فجلس الیہم فقال : ھل لکم الی خیر مما جئتم لہ فقالوا وما ذاک قال انا رسول اللہ بعثنی اللہ الی العباد ادعوھم الی اللہ ان یعبدوا اللہ ولا یشرکوا بہ شیئا وانزل علی الکتاب ثم ذکر الاسلام وتلا علیہم القرآن فقال ایاس بن معاذ وکان غلاما حدثا ای قوم ، ھذا واللہ خیر مما جئتم لہ

مدینہ کے مشرک سردار ابوالحیسم مدینہ سے مکہ آئے۔ ان کے ساتھ بنو عبد الاشہل کے کچھ جوان تھے۔ ان میں ایاس بن معاذ بھی شامل تھے (جو بعد کو مسلمان ہوگیے) وہ لوگ قبیلہ خزرج کے مقابلہ میں قریش کو اپنا حلیف بنانا چاہتے تھے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی آمد کی خبر سنی تو آپ ان کے یہاں گیے۔ آپ ان کے پاس بیٹھے اور فرمایا : تم لوگ جس مقصد کے لیے آئے ہو، کیا اس سے بہتر چیز کی تمھیں رغبت ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ کیا چیز ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ اس نے مجھے بندوں کی طرف بھیجا ہے۔ میں ان کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں کہ وہ اللہ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں۔ اور خدا نے میرے اوپر کتاب اتاری ہے۔ پھر آپ نے اسلام کا تذکرہ کیا اور ان کو قرآن پڑھ کر سنایا۔ یہ سن کر ایاس بن معاذ نے کہا ، وہ اس وقت ایک نوجوان تھے ، کہ اے قوم ، یہ خدا کی قسم اس سے بہتر ہے جس کے لیے تم یہاں آئے ہو۔

مکہ قدیم زمانہ میں عرب کا مرکز تھا۔ مختلف بیرونی مقامات سے لوگ مکہ آتے رہتے تھے۔ کوئی سیاسی مقصد سے آتا، کوئی تجارتی مقصد سے، کوئی مذہبی مقصد سے۔ سیرت کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جب ایسی کسی جماعت یا کسی شخص کی آمد کی اطلاع ملتی تو آپ چل کر اس کے

پاس جاتے اور اس کے سامنے اسلام پیش کرتے۔ پھر کوئی مانتا اور کوئی انکار کر دیتا۔ دیگر اصحاب بھی اسی اسوہ پر عمل کرتے۔

موجودہ زمانہ میں مجموعی اعتبار سے عرب ملکوں کی یہی صورت ہو رہی ہے۔ یہاں دنیا بھر سے لاکھوں کی تعداد میں لوگ آرہے ہیں۔ ان میں بہت بڑی تعداد غیر مسلموں کی ہوتی ہے۔ یہ لوگ معاش کے حصول کے لیے یا دوسرے مقاصد کے لیے عرب ملکوں میں آتے ہیں۔ اس طرح دوبارہ زیادہ بڑے پیمانہ پر وہی موقع پیدا ہو گیا ہے جو قدیم زمانہ میں رسول اور اصحاب رسول کو حاصل تھا۔

آج ضرورت ہے کہ عرب ممالک میں نہایت خاموش اور نہایت منظم انداز میں اسی طرح لوگوں کے سامنے دین حق کی دعوت پیش کی جائے جس طرح دور اول میں پیش کی گئی تھی۔ انھیں بتایا جائے کہ تم لوگ یہاں پٹرو ڈالر کے لیے آئے ہو، مگر ہمارے پاس تمہارے لیے اس سے بھی زیادہ بڑی چیز ہے۔ وہ اللہ کا سچا دین ہے جو آدمی کے لیے جنت میں داخلہ کی ضمانت ہے۔ پٹرو ڈالر تمہارے معیار زندگی کو کچھ بڑھا سکتا ہے۔ مگر خدا کا سچا دین اختیار کرکے تم اپنی ابدی زندگی کو لامحدود طور پر کامیاب کر سکتے ہو۔

اگر ایسا کیا جائے تو یقین ہے کہ ان میں "ایاس بن معاذ" کی طرح ایسے لوگ نکلیں گے جو کہہ پڑیں کہ ——— ای قوم، ھذا واللہ خیر مما جئتم لہ (اے لوگو، یہ اس سے بہتر ہے جس کے ارادہ سے تم یہاں آئے ہو) اس طرح یہ ہوگا کہ عرب دنیا جو آج لوگوں کے لیے صرف پٹرو ڈالر حاصل کرنے کا ذریعہ بنی ہوئی ہے وہ اس سے زیادہ بڑی دولت، دین حق کی دولت حاصل کرنے کا ذریعہ بن جائے گی۔

اطلاعات بتاتی ہیں کہ اس وقت بھی عرب دنیا میں لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ بیرونی ملکوں کے جو لوگ عرب ممالک میں تلاش روزگار کے لیے جاتے ہیں وہ اپنی معاشی ضرورت کے تحت عربی زبان سیکھتے ہیں۔ وہ اسلامی تہذیب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ عربوں سے میل ملاپ کے دوران اسلام کے بارہ میں معلومات حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی ایک تعداد اسلام سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیتی ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کسی دعوتی جدوجہد کے بغیر اسلام قبول کر رہے ہیں۔ اب اگر باقاعدہ طور پر دعوت و تبلیغ کی جدوجہد شروع کی جائے اور اس کو حکیمانہ انداز میں چلایا جائے تو یہ رفتار یقینی طور پر بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔

سب سے بڑی خبر

۳۰ جون ۱۹۸۵ کو الہ آباد کے لیے ایک تاریخی دن تھا۔ آج یہاں کے فوجی ہوائی اڈہ پر خصوصی سرگرمیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندستان نے جدید طرز کا جنگی جہاز (Mirage 2000) جو فرانس سے خریدا ہے اس کو ہندستانی ہوائیہ میں شامل کرنے کی رسم یہاں ادا کی جانے والی تھی۔

ہندستان کے ۱۲ ویں ائرچیف مارشل ایل ایم کتری (۱۹۸۵-۱۹۲۷) آج بہت خوش دکھائی دے رہے تھے۔ انھوں نے اس تقریب میں پورے جوش کے ساتھ شرکت کی۔ مگر ائرچیف مارشل اس شاندار تقریب سے دہلی واپس لوٹے تھے کہ ان پر دل کا دورہ پڑا۔ انھیں تیزی سے فوجی اسپتال لے جایا گیا جہاں چند گھنٹہ بعد یکم جولائی ۱۹۸۵ کو ان کا انتقال ہوگیا۔

خبروں میں بتایا گیا ہے کہ ائرچیف مارشل ایل ایم کتری لائق ترین پائلٹ تھے (Ablest fighter pilot) تھے۔ انھوں نے کئی جنگوں میں دشمن کے خلاف فضائی لڑائی کا شاندار ریکارڈ قائم کیا تھا۔ مگر دشمن کے پُرشور جنگی جہازوں کو مار گرانے والا شخص موت کے خاموش حملہ کا مقابلہ نہ کرسکا۔ وہ شخص جس نے فضا میں بلند ہو کر اعلیٰ جنگی فتوحات حاصل کی تھیں وہ زمین پر موت کے خلاف جنگ میں اس طرح شکست کھا گیا جیسے کہ اس کے مقابلہ کے لیے اس کے پاس کوئی طاقت ہی نہیں۔

طاقت اور بے طاقتی کا یہ مقابلہ ہر روز کسی نہ کسی شکل میں زمین پر پیش آتا ہے۔ ہر روز کوئی "ائرچیف مارشل" موت کے خاموش حملہ کے مقابلہ میں یک طرفہ شکست کھا جاتا ہے۔ اور اس طرح اپنے تجربہ کی صورت میں دوسروں کے لیے ایک اعلان کرتا ہے، اس حقیقت کا اعلان کہ انسان ایک ایسی دنیا میں ہے جہاں ہر فتح بالآخر کامل شکست پر ختم ہوتی ہے۔ زندگی اختیار سے بے اختیاری کی طرف سفر ہے۔ موت آدمی کو اسی حقیقت کی خبر دیتی ہے۔ مگر یہی خبر ہے جو آج کسی کو معلوم نہیں۔

۱- ۲۹ ستمبر ۱۹۸۵ کو مہینہ کا آخری اتوار تھا۔حسب معمول مرکز میں ماہانہ درس قرآن کا پروگرام ہوا۔ اس اجتماع کا اعلان دہلی کے متعدد اخبارات میں شائع ہوگیا تھا۔(مثلاً پرتاپ اردو، نوبھارت ٹائمس ہندی، ہندستان ہندی، ہندستان ٹائمس انگریزی، اسٹیٹسمین انگریزی) صدر اسلامی مرکز نے سورہ الفتح کی ابتدائی آیات کی روشنی میں درس دیا۔اس درس کا ٹیپ مرکز میں موجود ہے۔سامعین میں زیادہ تر اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے۔سپریم کورٹ کے ایک غیر مسلم بیرسٹر بھی آنے والوں میں شامل تھے۔

۲- الرسالہ کیسٹ کا سلسلہ خدا کے فضل سے کافی پسند کیا جارہا ہے۔اس سلسلہ میں بطور نمونہ ایک انگریزی خط کا ایک پیراگراف یہاں نقل کیا جاتا ہے۔یہ خط ہم کو بمبئی سے موصول ہوا ہے اور اس پر ۱۱ ستمبر ۱۹۸۵ کی تاریخ درج ہے:

Immediately after receiving the cassettes I heard it and I have been much impressed and influenced by the contents. I think such lectures through the cassettes will help to awaken the minds and hearts of the people. It will also remove the misunderstanding regarding Islam especially from the minds of the Muslims which is more essential at this time.

۳- الرسالہ کے مطالعہ سے لوگوں میں کس قسم کے اثرات پیدا ہورہے ہیں۔اس کی مثالیں روزانہ سامنے آتی رہتی ہیں۔ایک صاحب جو باہر سے صدر اسلامی مرکز سے ملنے آئے تھے انھوں نے کہا کہ میرا تجربہ ہے کہ جو لوگ الرسالہ کا برابر مطالعہ کرتے ہیں ان میں سنجیدگی اور حقیقت پسندی پیدا ہوجاتی ہے۔محبوب نگر سے ایک صاحب کا خط (۱۲ اپریل ۱۹۸۵) موصول ہوا ہے۔ اس خط کا ایک حصہ یہ ہے:

میں حیدرآباد بذریعہ ٹرین جانے کی تیاری میں تھا کہ الرسالہ اپریل ۱۹۸۵ آپہونچا۔میں نے سوچا کہ ڈھائی گھنٹے کے سفر کا ساتھی مل گیا۔ٹرین چلتی رہی۔میں الرسالہ میں محو تھا۔یہاں تک کہ آخری مضمون شروع ہوا۔رقت طاری ہوتی گئی، آنسو رواں ہوگئے۔گردوپیش کی کچھ خبر نہ رہی، یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میں سفر میں ہوں میرے اطراف کم ازکم چار چھ مسافر تو مجھے دیکھ رہے ہوں گے۔مضمون ختم ہوا تو پاس میں بیٹھے ایک غیر مسلم معمر ہم سفر نے پوچھا کیا بات ہے

بھائی کوئی ٹریجڈی بھری کہانی پڑھ رہے تھے کیا؟" میں نے کہا نہیں یہ مذہبی پرچہ ہے۔ پھر میں نے ان کے کہنے پر مضمون کے بارہ میں مختصراً بتاتے ہوئے کچھ اقتباسات پڑھ کر سنائے جس سے وہ کافی متاثر ہو کر کہنے لگے "جو تحریک ایثار اور قربانی پر چلتی ہے وہ ضرور کامیاب ہوتی ہے"

۴۔ ۵ اکتوبر ۱۹۸۵ کو گول مارکیٹ (نئی دہلی) میں ایک اجتماع ہوا۔ اس میں سب تعلیم یافتہ حضرات شریک تھے۔ صدر اسلامی مرکز نے اسلامی عبادت کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے نماز کی حقیقت پر تقریباً ایک گھنٹہ گفتگو کی۔ اجتماع میں بعض غیر مسلم حضرات بھی شریک تھے۔

۵۔ "تعبیر کی غلطی" (مکمل) زیر کتابت ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی کتابت کی تکمیل کے بعد شائع کر دی جائے گی۔

۶۔ اسلامی مرکز کی مطبوعات کی اشاعت کا دائرہ خدا کے فضل سے دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ حکومت ہند کی وزارت تعلیم نے اپنے خط نمبر (F. No. 5-7/81-BPU) مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۸۵ کے تحت ماہنامہ الرسالہ کی خریداری منظور کی ہے۔ چنانچہ انھیں الرسالہ بذریعہ ڈاک بھیجنا شروع کر دیا گیا ہے۔

۷۔ مہاراشٹر اسٹیٹ بیورو آف ٹکسٹ بک پروڈکشن اینڈ کریکولم ریسرچ نے اپنے خط مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۵ ہم کو مطلع کیا ہے کہ انھوں نے اسکولی نصاب کی ایک کتاب میں الرسالہ کے بعض مضامین کو شامل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی طرف سے جو خط موصول ہوا ہے اس کا فوٹو مقابل کے صفحہ پر شائع کیا جا رہا ہے

۸۔ اطلاع ملی ہے کہ بعض مقامات پر کتب خانے یہ کر رہے ہیں کہ وہ الرسالہ کیسٹ ایک یا زیادہ تعداد میں منگاتے ہیں اور جو لوگ خرید نہیں سکتے ان کو معمولی رقم پر کرایہ پر دیتے ہیں۔ اس طرح وہ لوگ بھی الرسالہ کیسٹ سے فائدہ اٹھا رہے ہیں جو بیک وقت پوری رقم ادا کر کے کیسٹ کو خرید نہیں سکتے۔ یہ طریقہ بہت مفید ہے۔ ضرورت ہے کہ دوسرے مقامات پر بھی اس کو اختیار کیا جائے۔

۹۔ دسمبر ۱۹۸۵ میں الرسالہ کیسٹ کا پہلا سلسلہ پورا ہو جائے گا۔ یہ کل پانچ کیسٹ ہیں۔ ان کی تقریروں کو علاحدہ کتابی شکل میں شائع کرنے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ اس کا نام الرسالہ کیسٹ حصہ اول ہوگا انشاء اللہ العزیز۔

MAHARASHTRA STATE BUREAU OF TEXTBOOK PRODUCTION AND CURRICULUM RESEARCH

'Balbharati', Senapati Bapat Marg, Pune-411 004. Phone : Director-58235. Office : 54264-65-66-67

No. Urdu/
Date : 15.10.1985

Maulana Wahiduddin Khan
AL-RISALA Monthly
C-29 Nizamuddin West
NEW DELHI 110 013

Dear Maulana Saheb,

The Urdu Language Committee of the Bureau desires to include a passage of your travelogue as described by you in your esteemed journal,"AL-RISALA". The Committee has edited the report to suit to the age group of the students for Std. VII.

I am sending to you a copy of the edited piece for your approval with a request to allow the Committee to include the same in the proposed MSS of the Urdu reader for Std. VII.

Thanking you,

Yours faithfully,

Special Officer for Urdu

Controller, 'Neelam', 108, Dr. R. G. Thadani Road, Bombay-400 018 Phone : 375406 (P), 392981 (O)
Depot Manager, Textbook Stores and Distribution Centre, Balbharti', Senapati Bapat Marg, Pune-411 004. Phone : 54264.
Depot Manager, Textbook Stores and Distribution Centre, 10, Industrial Estate, S. Vivekanand Rd.,Goregaon, Bombay-62. Tel. : 69
Depot Manager, Textbook Stores and Distribution Centre, Shri Datta Prasad, Dhantoli, Nagpur-440 001. Phone : 23078.
Depot Manager, Textbook Stores and Distribution Centre, Industrial Estate, Aurangabad 431 001. Phone : 2110.

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۰۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسؤل نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

الرسالہ
کیسٹ

الرسالہ کیسٹ کی روانگی شروع ہوگئی ہے

انفرادی خریدار اطلاع بھیج کر جلد اپنی خریداری درج کرادیں۔

جو حضرات اس کی ایجنسی لینا چاہیں

وہ بھی اپنی مطلوبہ تعداد سے مطلع فرمائیں۔

الرسالہ کیسٹ کی ایجنسی کم از کم پانچ کیسٹوں پر دی جائے گی۔

کمیشن :

۲۵ کیسٹ تک —— ۲۰ فی صد

۲۵ کیسٹ سے زیادہ —— ۲۵ فی صد

(ہدیہ فی کیسٹ ۲۵ روپیہ)

Regd. No. D(SE) 243
Regd. R.N. No. 28822/76

December 1985
Number 109

AL-RISALA MONTHLY
C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128